# میں بھی افسانہ تم بھی کہانی

اقبال متین

1). AWARDED BY
A.P. Urdu Academy
2). AWARDED BY
U.P. Urdu Academy

# میں بھی افسانہ تھا میں بھی کہانی تھا

افسانے


اقبال متین



"کہانی"
کتاب نگر
نظام آباد (اے پی)
۵۰۳۰۰۱

نام کتاب :- "میں بھی فسانہ تم بھی کہانی"
نام مصنف :- اقبال متین
تاریخ اشاعت :- ڈسمبر ۱۹۹۲ء
تعداد اشاعت :- (۵۰۰)
سرورق :- قیصر سرمست
کتابت :- فضل محمد
طباعت :- اعجاز پرنٹنگ پریس
پتے :- "کہانی" کتاب نگر- نظام آباد ۵۰۳۰۰۱
نیشنل بک ڈپو- نظام آباد- ۵۰۳۰۰۱
اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار- حیدرآباد
حسامی بک ڈپو- چار کمان حیدرآباد

قیمت :- R.P.Rs.47/-

یہ کتاب آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

# فہرست

افسانے — (صفحات)

# انتسابؔ

"میں بھی فسانہ تم بھی کہانی" اس کے کرداروں کے ساتھ زمانے تک سسک رہی تھی۔ میرے دوستوں عابد سہیل اور بلراج ورما کی محبتیں بھی اس کے آنسوؤں کا مداوا نہ کر سکیں —— اس کتاب کو "آگہی کے ویرانے" اور "ملبہ" ان دونوں کتابوں سے بہت پہلے شائع ہو کر اپنے وجود کا احساس دلانا تھا —— لیکن مالی موانعات نے ہم تینوں کو بے کل رکھا ——

اب ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ فن کی زندگی کو ایک دہائی (ONE Decade) یا دو دہائیوں کے پیمانوں میں ناپنے والے زندگی کو کس زمرے میں رکھتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ کہانی جب جنم لیتی ہے تو زندگی کے ساتھ ہو جاتی ہے اور زندگی

اپنی تجسیم کا عمل ایک جسم سے دوسرے جسم اور ایک ثانئے سے دوسرے ثانئے میں جاری و ساری رکھتی ہے۔ کہانی کا یہ تنفس بھی زندگی کی محزون و مسرور سانسوں ہی کا مرہونِ منت بھی ہے۔ جزولاینفک بھی۔

یوں نہیں ہے تو کہانی زندہ نہیں رہے گی اور اگر یوں ہے تو کہانی کو کوئی نہیں مار سکتا۔

میں اس مجموعے کو زندگی کے نام اور پھر بلراج ورما اور عابد سہیل کے نام منسوب کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

اقبال متین



# یہ
# کِس کی
# تصویر
# ہے؟

یہ جو سامنے کی دیوار پر مستطیل نما بڑی سی تصویر ہال کے چوتھائی
حصے پر پھیلی ہوئی ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ماڈرن آرٹ انسان کی
شکل و صورت سے بہت آگے نکل کر اس کی اندرونی کیفیات اور جذبات کی
آئینہ داری کرتا ہے۔ یہ دعوے سارے کے سارے مجھے بکواس نظر آتے ہیں۔
میں تنہا بیٹھا وسکی پی رہا ہوں، ویسے 'من جو' کا سارے کا سارا ہال تقریباً
بھرا ہوا ہے، کتنے چہرے، کتنے تبسم، کتنے قہقہے، کتنے سکون، سب خلط ملط ہیں۔
ایک کو دوسرے سے جدا کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ میری تنہائی صرف اس معنی
میں ہے کہ کوئی شریک بادہ و جام نہیں ہے، ورنہ میں انسانوں کی اس مسحور کن
بزم میں شامل ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ تنہائی کا دور دور تک احساس البتہ
نہیں ہے۔ صرف اس تصویر کا نہ سمجھ میں آنا ہی کہ مجھے بار بار بادہ خواروں کی

اس بزم سے الگ تھلگ کرلیتا ہے اور میں شاداب چہروں، گلنار چہروں، اداس چہروں، گمبھیر چہروں اور ویران چہروں کی اس محفل سے پل دو پل کے لئے کٹ جاتا ہوں اور میرا وجود اس تصویر سے چمٹ جاتا ہے۔

اس بڑی تصویر کو بہ یک نظر میں سمجھ نہیں پاتا ہوں تو اس کے مجموعی تاثر سے بالکل بے نیاز ہوکر جو مجھ پر سر سے کوئی تاثر ہی نہیں چھوڑتی ہے، ایک ایک حصے کو علٰحدہ علٰحدہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

سیدھی جانب یہ جو عجیب سا ایک ہیولیٰ ہے شاید کسی غمزدہ انسان کا مسخ شدہ چہرہ ہے۔ موت کسی بھی آدمی کے ساتھ میخانے میں داخل نہیں ہوتی وہ تو باہر ہی کھڑی اس کی منتظر ہوتی ہے۔ پھر یہ چہرہ اس قدر مسخ کیوں ہے۔ جیسے ہم بجلی کے خزانہ پر "خطرہ" کے جلی حروف میں لکھے ہوئے لفظ کے نیچے ہڈیوں کی مقراض کے درمیان انسان کے بچے ہوئے چہرے کی صرف ہڈیاں دیکھتے ہیں اور کراہیت کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے تصویر کے اس مسخ شدہ چہرے سے اسی قسم کی کراہیت محسوس ہورہی ہے۔ میری نظریں آہستہ آہستہ تصویر کے دوسرے حصوں کا طواف کررہی ہیں لیکن سوائے دھندلے دھندلے چھوٹے بڑے دھبوں کے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑرہا ہے۔ کوئی تصور اگر اس تصویر سے ذہن میں ابھرتا ہے تو وہ صرف بے سروسامانی اور لُٹی لُٹی دنیا کا تصور ہے اور یہ تصور مجھے کچھ اداس کرنے لگتا ہے۔

میں "من جو" میں جب داخل ہوا تھا تو وہ ساری اداسیاں جو میرے جلو میں دبے پاؤں چلی آرہی تھیں "من جو" کے دروازے پر اس طرح ٹھٹک کر

رک گئیں جیسے ان کی جیب خالی تھی اور میں اپنی جیب کے سہارے اکیلی باہر چھوڑ کر "من جو" میں داخل ہو گیا تھا، لیکن جب میں نے وہسکی کا دوسرا گلاس بھر لیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ اداسیاں اس سامنے پھیلی ہوئی تصویر کے راستے ہال میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

میں نے جھنجھلا کر اس تصویر سے آنکھیں پھیر لی ہیں ——— اور "من جو" کے ہال میں سجی ہوئی انسانی چہروں کی رنگا رنگ بزم میں شامل ہو گیا ہوں۔

میری دائیں جانب قریب ہی کی میز پر تین نوجوان ریکارڈ پر بجتے ہوئے آرکسٹرا کی دھن پر اپنے پیروں کو حرکت دے رہے ہیں اور ان کے جسم ایک خاص یکسانیت سے اپنے صوفوں پر تھرک رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں۔ ان نوجوانوں میں جو سب سے زیادہ ڈاڑھی بڑھائے ہے، وہی سب سے زیادہ نحیف و ناتواں بھی ہے۔ اس کے چہرے پر جوانی کم ہے اور ہڈیاں زیادہ ہیں۔ ان کے بیر کے شیشے خالی ہو گئے ہیں اور گلاس بھرے ہوئے ہیں۔

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی عمر کا حساب کتاب لگا کر اسی مقدار سے غازہ، سرخی اور لپ سٹک اپنے چہرے پر تھوپ رکھی ہے۔ وہ جب ہال میں داخل ہوئی تو زیادہ جوان تھی لیکن شراب کی گرمی سے جیسے اس کا غازہ اور سرخی پگھل رہی ہے اور اصلی قد و خال نمایاں ہو رہے ہیں، اس کے ساتھ جو نوجوان ہے وہ اس ادھیڑ عورت میں زندگی ڈھونڈ رہا ہے۔ جیسے میں سامنے لگی تصویر میں ایک جہان معانی ڈھونڈ رہا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ ایک بڑی سی ٹوکری کی ٹوپی لے آؤں اور اس عورت کے سر پر رکھ کر تالیاں بجاؤں۔

یہ شرارت مجھے یوں سوجھتی ہے کہ میں نے کہیں پڑھا —— پیرس کے ایک سینما ہال میں اکثر عورتیں، لنگا ڈنگ ٹوکری نما ٹوپیاں پہنے جب اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیتیں تو پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظروں اور اسکرین کے درمیان ان کی یہ ٹوپیاں حائل ہو جاتیں اور پکچر انھیں دکھائی نہ دیتی۔ جب ان لوگوں نے منتظمین سے شکایت کی تو سینما ہال میں اس مضمون کا بورڈ لٹکا دیا گیا۔

"صرف بوڑھی خواتین ہیٹ پہن کر سینما دیکھ سکتی ہیں"

اور اب —— وہاں کوئی عورت ہیٹ پہن کر سینما نہیں دیکھتی ہے۔

میں سوچتا ہوں مرد آخری سانسوں تک عورت سے چمٹا رہتا ہے اور اسی لئے عورت آخری سانسوں تک صرف جوانی سے چمٹی رہتی ہے۔

میری نشست کے بالکل مقابل جو میز دھری ہے' اس پر کوئی سابقہ فوجی افسر اپنے "ایکس کیپٹن" ہونے پر اس طرح فخر کر رہا ہے جیسے اب بھی مادر وطن کی آزادی کا سارا بوجھ اسی کے کندھوں پر رکھا ہے اور بیئر سے بھری ہوئی اس کی بوتل کوئی ایسا نیوکلیر ہتھیار ہے جس سے یہیں بیٹھے بیٹھے وہ مادر وطن کی مدافعت کر سکتا ہے۔ اس "ایکس کیپٹن" نے اپنی کپتانی سے کچھ زیادہ ہی چھچھالی ہے۔

میں اب صرف اس کپتان میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ تصویر کی جانب میری نظریں اب اس طرح اٹھتی ہیں جیسے دیوار کی جانب مریض کی نظریں اٹھ رہی ہوں۔

کی نظریں اٹھ رہی ہوں۔

ادھیڑ عمر کی عورت اور نوجوان مرد ابھی تک سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

ٹائی لڑکے کسی انگریزی لئے کی دھیمے سروں میں نقل کر رہے ہیں۔ لیکن میری نگاہوں کا مرکز وہی سابقہ کپتان ہے جو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کسی نواب زادے سے سینہ تان کر باتیں کر رہا ہے۔

یہ نواب زادہ اپنی پوشاک اور اپنے چہرے بشرے سے دن بھر مشین پر کام کر کے تھکا ہوا درزی دکھائی دیتا ہے لیکن سابقہ فوجی افسر اور نواب زادہ ایک دوسرے کی ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں ـــــــ میں ان دونوں میں کوئی قدر مشترک ڈھونڈ رہا ہوں۔

یہ فوجی افسر بڑی معصوم باتیں کر رہا ہے۔ وہ بار بار درزی نما نواب زادے کو اپنے قریب گھسیٹ کر کہتا ہے ـــــــ "وی آر سولجرز" ـــــــ ہم فوجی ہیں ـــــــ اور بوتل سے اپنے گلاس میں اس ادا سے بیر انڈیلتا ہے جیسے ریوالور کی تیسری گولی چلا رہا ہو ـــــــ

نواب زادے کے سوال پر کہ آیا اس نے دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا تھا؟

سابق کپتان بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے ـــــــ میں نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا ـــــــ اور اس طرح سینہ تان کر بیر کا گلاس اٹھاتا ہے جیسے دنیا بھر کے ہر فوجی سے صرف اس ایک خصوصیت کی بنا پر

خود کو ممیز کر رہا ہو۔

نواب زادہ لیکن تُلا ہوا ہے کہ فوجی کپتان کی نئی دوستی پر فخر کر سکے۔

کوئی ایسا واقعہ اپنی فوجی زندگی کا سنائیے جس میں آپ کی جان پر بن گئی تھی؟

میں جھک کر ایش ٹرے لینے کے بہانے ذرا اور کھسک کر ان دونوں سے ممکنہ قرب حاصل کر لیتا ہوں ـــــ فوجی افسر اتنا معصوم نہ ہوتا تو اس سوال کے جواب میں یقیناً اس کی جان پر بن گئی ہوتی ۔ لیکن وہ کہنا شروع کرتا ہے۔

جب میں رائیڈنگ (Riding) کی ٹریننگ پا رہا تھا ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ۔ ایک معجزہ ـــــ سوچتا ہوں تو آج تک حیرت ہوتی ہے ـــــ وہ کہہ رہا تھا ـــــ وہ کہتا گیا ـــــ " مجھے ایک بار بہت ہی شریر گھوڑا دیا گیا ۔ جو بے قابو ہو رہا تھا ـــــ میں کوشش کر کے تھک گیا لیکن وہ قابو میں نہ آیا ۔ آخر شش میں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا ۔ اب جہاں اس کا جی چاہتا وہ مجھے لے کر بھاگتا ۔ میں بس اس کی پیٹھ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا ـــــ وہ بھاگتا بھاگتا ایک پہاڑی پر چڑھ گیا ۔ جب بہت بلندی پر ہم پہنچ گئے تو میری نظر پاس ہی کی ایک گہری کھائی پر پڑی جس کے بیچوں بیچ ٹرین کی پٹڑیاں چمک رہی تھیں ـــــ میں سمجھ گیا کہ اب موت ہی مجھے اس گھوڑے کی سواری سے بچائے گی ۔ میں نے آخری بار اس کا رُخ موڑنے کے لئے باگ کو کئی جھٹکے دیئے ۔ لیکن گھوڑا اس کشمکش میں اور بھی بپھر

گیا اور کھائی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ــــ پھر میں نے دیکھا ــــ نیچے بہت نیچے ٹرین رینگ رہی ہے اور اس کا دھواں سگریٹ کا دھواں معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے بعد میں اور گھوڑا بلندی سے شاید نیچے آ رہے تھے مجھ پر غشی طاری تھی۔"

"آنکھ کھلی تو لوگ مجھے ہوش میں لانے کے جتن کر رہے تھے۔ ٹرین ٹھہری ہوئی تھی۔ مسافروں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ جب مجھے پوری طرح ہوش آیا اور گارڈ نے سہارا دیکر مجھے اٹھایا تو میں نے دیکھا، گھوڑے کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا ــــ"

درزی نما نواب زادے نے فوجی افسر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور بڑے پیار سے انھیں دبا کر مبارکباد دی۔ اور کہا ــــ واقعی کارنامہ ہے۔

میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اگر یہ کارنامہ ہے تو خدائے بزرگ و برتر ہے یا گھوڑے کا یا فوجی افسر کا۔

درزی نما نواب زادے نے پھر کسی بات پر اس بات کا اعادہ کیا اسلم جنگ کا مشہور و معروف پل اسی کے دادا کے نام سے موسوم ہے جس وہ پوتا ہے۔

میرے ذہن میں جانے کیوں خیال آیا کہ درزی نما نواب زادے سے دادا کا پوتا ہے یا اسلم جنگ پل کا پوتا ــــ لیکن ادھر نواب زادہ نے سینہ تان رکھا تھا ادھر سابقہ فوجی افسر نے ــــ اور میں دیکھ رہا تھا کہ

ان تنے ہوئے سینوں کے درمیانی فصل میں جو میز حائل تھی وہ دراصل نواب زادے کے اسلاف کو فوجی افسر کے مرحوم گھوڑے سے ملا رہی تھی۔

ایک قہقہہ اٹھتا ہے اور ہال کے آخری کونے میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو میں ایک نئے آدمی کا سواگت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں میری میز سے یہ لوگ اتنی دور تھے کہ میں ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ کانوں کے فرائض بھی آنکھوں کے سپرد کیے میں اس نتیجہ پر پہنچ سکا تھا کہ یہ لوگ اسی بات پر ہنس رہے تھے جس بات پر میرا جذبہ ترحم ان ہی میں سے ایک آدمی میں ابھرا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ اس ڈیڑھ دو گھنٹہ کے دوران یہ آدمی جس کے گال پچکے ہوئے تھے کوئی بارہویں بار لاوڈری میں ہو آیا تھا ـــــ میرے ذہن میں ایک رکیک سا خیال آیا ہے۔ ایک گندہ سا تصور ابھرا ہے ـــــ اور وہ یہ ہے ـــــ لیکن ٹھہریئے اس کو پڑھے بغیر گذر جائیے۔

اگر یہ پچکے ہوئے گال والا آدمی مر جائے تو اس کی کفنائی ہوئی لاش کو اٹھانے سے اس کے گیلے اور بھیگے ہوئے کفن کے باعث لوگ اس لئے احتراز کریں گے کہ ڈولے میں اس کا پیشاب ٹپکتا رہے گا۔

اور اگر اس کو جلایا جائے تو لکڑیاں بجھ بجھ جائیں گی۔

لیجئے وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا ـــــ اس کے ساتھی پھر ہنسنے لگے اور وہ جھومتا ہوا لاوڈری کی جانب روانہ ہو گیا۔

میری میز کی شفاف سطح پر دھرے ہوئے گلاس اور شیشوں کا دھندلا عکس میرے ذہن میں کسی ایسی چیز کی یاد تازہ کر رہا ہے جس سے میں کچھ

واقف تھا ـــــ لیکن وہ کیا بات تھی، وہ کیا شئے تھی، مجھے کچھ یاد نہیں، اور اُس یاد کے یہ نقوش اتنے ہی دھندلے ہیں جیسے میز کی سطح پر شیشوں کا عکس۔ لیکن مجھے جانے کیوں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ میز پر چھائی ہوئی دھندسی میں نے ابھی ابھی کہیں اور بھی دیکھی ہے۔

ادھیڑ عمر کی عورت پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنی لپ اسٹک درست کر رہی ہے۔ اس کا جوان ساتھی اس لپ اسٹک کو شاید اس کے اپنے ہونٹوں پر پھیلا ہوا دیکھنے کا منتظر ہے اور میں اپنا کوئی ٹوکری نما ٹوپی اس عورت کو پہنانے پر مائل نہیں ہوں۔

ٹیڈی لڑکے ٹڈوں کی طرح زیادہ اچھل کود رہے ہیں۔ بیرا میرے آگے سے مرغ کی ایک ڈش لے کر ابھی ابھی گزرا ہے اور میرے نتھنے پھڑک رہے ہیں۔

مجھے اپنی بیوی یاد آرہی ہے۔ جو مجھ سے کہا کرتی ہے کہ تم اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر رہو بھی تو جلتی ہوئی دال اور داغ لگے ہوئے چاولوں کی بُو پر اسطرح چونک کر شور مچاتے ہو جیسے میز پر بیٹھے ہانڈیاں بھون رہے تھے۔ میری بیوی کی ناک مثالی حد تک خوبصورت ہے ـــــ ستواں سجیلی جس میں ایک جگمگاتی، جھل مل کرتی، کیل پہنانے کی مجھے بڑی حسرت ہے لیکن میری بیوی کو میری قوت شامہ پر بڑا اعتماد ہے۔ رات کی رکھی ہوئی کوئی اترن ہو تو وہ بلا تکلف میری طرف بڑھا دیتی ہے اور بس ذرا سا سونگھ کر تصدیق کر دیتا ہوں کہ ہاں یہ چیز اتر گئی ہے۔

اس وقت جبکہ بیرا مرغ کی ڈش لے کر میرے آگے سے ابھی ابھی گذرا ہے اور میرے نتھنے اس مرغ کی خوشبو سے پھڑک رہے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اتنا شور مچاؤں کہ جہاں جہاں مرغ پلیٹوں میں رکھے ہیں سب کے سب ایستادہ ہو کر بانگ دینے لگیں ـــــ لیکن مجبوری ہے ۔ میں کیا کر سکتا ہوں ۔ "من جو" میں شور مچانا میرے بس سے باہر ہے' اور میں احتجاجاً اپنا خالی گلاس بھر لیتا ہوں ۔

پیتے وقت مرغ سے بڑھ کر کوئی چیز لذیذ نہیں ہوتی اور پینے کے بعد عورت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ پہلی بات میں کرتا ہوں اور دوسری بات لوگ کرتے ہیں ـــــ اور اگر دونوں ہی باتیں میں کرتا ہوں تو بھی ایسا کیا فرق پڑتا ہے ۔

میں نے اپنے بھرے ہوئے گلاس سے ابھی دو تین ہی گھونٹ پیئے ہیں ۔ میری نظر ایک نظارد پر پڑتی ہے ۔ ادھیڑ عمر کا یہ شخص بہت ہی جاذب نظر ہے ۔ چہرے کے تیکھے نقوش کہہ رہے ہیں کہ مجھے کبھی چاہا گیا ہے ۔ مجھے اس آدمی کو دیکھ کر اس شاندار عمارت کے کھنڈر یاد آ رہے ہیں جس میں میں نے کبھی اپنی محبوبہ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی اور آج وہی محبوبہ میری بیوی ہے ۔ مجھے شاید کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ آج میں خود اسی شاندار عمارت کا جیسے کھنڈر ہوں اور میری بیوی آج بھی اسی کھنڈر میں میری منتظر ہے ۔ معاشی خوش حالی نصیب نہ ہو تو عاشق شاید اپنی محبوبہ کا شوہر بننے کے بعد کچھ اسی طرح سوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ کچھ سوچتا ہی نہیں ۔ لیکن میں ابھی اپنے گھر کی دھرتی سے اس قدر بلند نہیں ہو سکا ہوں ۔

اس شخص کی جاذب نظر شخصیت سے زیادہ میں جو اس میں دلچسپی لگا رہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی بوشرٹ پشت پر نمایاں طور پر پھٹی ہوئی ہے اور وہ اس کی بوسیدگی سے بالکل بے نیاز ہے ۔ وہ اطمینان سے ہال کے درمیان سے گذرتا ہوا کاؤنٹر تک پہنچ جاتا ہے ۔ کتنی ہی نظریں اس کے چہرے سے زیادہ اس کی پھٹی ہوئی بوشرٹ میں پناہ لیتی ہیں جیسے اپنے احساس برتری پھیلنے کے بہانے دراصل ظاہر کر رہی ہوں ۔ وہ کاؤنٹر پر پہنچ کر سارے ہال کی جانب پشت کئے بیٹھ گیا ہے اور بڑی سنجیدگی سے گلاس میں رم حاصل کر چکا ہے ۔ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے لیکن بوتل پر جلی حروف میں لکھے ہوئے رم کو پڑھ لیتا ہوں ۔ جب کاؤنٹر پر وہ اس کو دی جا رہی تھی ـــــــ تب ہی تو میں جان گیا ہوں کہ وہ رم پی رہا ہے ۔

درزی نما نواب زادہ فوجی افسر کو اشارے سے اس نووارد کی بوشرٹ بتلا رہا ہے لیکن فوجی افسر کی آنکھوں میں تضحیک کا وہ پہلو نہیں ہے جو نواب زادہ چاہتا ہے ۔

میری نظریں ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی ادھیڑ عمر کی عورت اور اس کے جوان ساتھی پر پڑتی ہیں جو بیرا کو آواز دے کر بل ادا کر رہا ہے ۔

سو روپے کا نوٹ دیکھ کر عورت کی آنکھوں میں چمک آ گئی ہے اور وہ زیادہ دلکش نظر آنے لگی ہے ۔ یا پھر یہ عورت جوان تو نہیں ہے ۔؟

میری نظریں سارے ہال کا طواف کر کے تصویر تک پہنچتی ہیں ـــــ

میں حیران رہ جاتا ہوں — بالکل ششدر — تصویر میری سمجھ میں آگئی ہے۔ بڑے سے کینوس پر پھیلے ہوئے اتنے سارے کے سارے ہیولے سبھی تو میری نظروں میں بالکل واضح ہو کر اپنے ایک ایک خط کو میری اپنی ذہنی کیفیت تک جیسے خود بخود لے آئے ہیں۔
میں سوچ رہا ہوں کچھ ہی دیر پہلے اپنی میز کے شیشے کی شفاف سطح پر اپنے 'گلاس' اپنی بوتل' پلیٹ' ایش ٹرے اور چمچوں کا دھندلا سا عکس جب میں نے غیر ارادی طور پر ایک خاص زاویئے سے دیکھا تھا تو مجھے خیال آیا تھا کہ بالکل یہی منظر میں نے ابھی ابھی اسی ہال میں کہیں دیکھا ہے۔ شاید میرے تحت الشعور میں بسی ہوئی یہ تصویر لمحہ بھر کو میرے شعور سے ٹکرائی تھی لیکن جانے پھر کہاں گم ہو گئی۔ اور اب جبکہ میں چوتھا پیگ ختم کر رہا ہوں۔ اب جبکہ ڈارلنگ وہسکی اپنی ساری مستیاں مجھ میں منتقل کر رہی ہے اب جبکہ میں جاگنے کی سرحدوں سے بس کچھ ہی آگے نکل کر بوجھل ذہن کو سبک محسوس کر رہا ہوں۔ اب جبکہ مجھے 'من جو' کا ماحول زیادہ دلکش لگ رہا ہے — اب جبکہ میں نے ادھیڑ عمر کی عورت کی آنکھوں میں جوانی کا نشہ محسوس کیا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ وہ تصویر تو میرے اپنے میز کی تصویر ہے۔

— چار پیگ' پانچ پیگ' چھ پیگ' — پی لینے کے بعد یہ تصویر من جو کے ہر میز کی شفاف سطح کی تصویر بن جاتی ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کے لئے آپ کو وہاں تک آنا پڑے گا جہاں اب میں ہوں'۔

میں اٹھ کر لاوٹری کو جانے کے بہانے تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھ دوں۔ پھر میری نظر 'من جو' میں بکھرے ہوئے میزوں پر پڑتی ہے۔ یہ تصویر من جو کے خوبصورت ہال میں چہار طرف بکھری ہوئی ہے — میں سوچتا ہوں

ماڈرن آرٹ کے بلند دعوؤں پر استہزا کرنے کا حق آخر مجھے کس نے دے دیا تھا اور اب یہ حق کس نے چھین لیا ہے۔

نو وارد "من جو" کی اس بزم بادہ گساراں سے بے نیاز سب کی جانب پشت کئے کاؤنٹر پر بیٹھا تیزی سے رم پی رہا ہے۔ اس کو نہ دیوار پر لگی تصویر سے کوئی واسطہ ہے نہ "من جو" میں بکھری ہوئی میزوں کی اصلی تصویروں سے جن کو کسی آرٹسٹ نے دیوار کے کینوس پر ابھار کر مقید کر لیا ہے۔ نہ ان انسانی جیتی جاگتی تصویروں سے جن کے پورٹریٹ صوفوں پر ہال میں چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔

لاونڈری میں مجھے پچکے ہوئے گالوں والا وہی شخص نظر آتا ہے جس کی نسبت میں نے سوچا تھا کہ اگر اس کو دفنایا جائے تو اس کا کفن تر رہے گا اور جلایا جائے تو چتا کی آگ بجھ بجھ جائے گی ـــــ اب یہ شخص قریب قریب لڑکھڑا رہا ہے۔ میں جب لاونڈری سے نکل آتا ہوں تو اس کے ساتھی اس کو لینے کے لئے لاونڈری میں داخل ہو رہے تھے اور پھر یہ جوگنتی میں چار ہیں۔ چار درویشوں کی طرح "من جو" سے باہر نکل جاتے ہیں۔

میں لاونڈری سے نکل کر اپنی میز پر پہونچنے تک پھر اس تصویر کے زندہ اور بولتے ہوئے آرٹ سے لطف اٹھاتا ہوں۔ یہ محسوسات کی تصویر ہے جو ذہن کی گرفت میں آکر نکل جاتی ہے۔ اس پر تم ٹھہر کر اچٹتی ہوئی نگاہیں ڈالنا چاہئے غور سے تکتے رہنے سے اس تصویر کا حسن متاثر ہوتا ہے جیسے احساسات مجروح ہو رہے ہوں ـــــ اس تصویر کے حسن کے تاثر کی عمر احساس کی عمر کی طرح مختصر ہے۔

منجھلا بھائی ـــــ منجھلا بھائی ـــــ یہ بالکل نئی آواز ہے جو میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ میرے بائیں کوچ میں میرے لاوڑی سے لوٹنے تک ایک بہت ہی عجیب الخلقت شخص بڑی تمکنت سے آبراجتا ہے۔ آپ اس تمکنت کی روداد تفصیل سے سنیں تو یقیناً کراہیت محسوس کریں اور مجھ سے ہمدردی کا جذبہ آپ کے ذہن میں بیدار ہو جائے کہ مجھ ناچیز پر اس آنکھوں دیکھے منظر سے کیا گذری ہے۔

یہ شخصیت جو ابھی ابھی آپ کی اور میری توجہ کا مرکز بنی ہے' گنٹور کی ایک بڑی رائس مل کی مالک ہے ـــــ رنگت کالی بھجنگ' فربہی کا بوجھ اٹھائے ڈھلی ہوئی عمر۔ پیٹ کچھ ایسا لٹکتا ہوا' جیسے بڑے سے بیلون کی آدھی سے زیادہ ہوا خارج کردی گئی ہو۔ پیر پھیلا کر وہ کچھ اس طرح صوفے پر بیٹھ گیا ہے کہ اس کی دھوتی کا ایک سرا اس کے پیروں میں الجھ کر نیم وا ہو گیا ہے۔ اس کی ایک ٹانگ رانوں سے اوپر دور تک ننگی ہو گئی ہے۔ اس دوری کے تصور میں مجھ سے آپ کا جذبہ ہمدردی ابھر جانا چاہیئے کہ میری آنکھوں پر کیا گذری ہو گی۔

مجھے چونکہ تلگو نہیں آتی ہے اس لئے میں انگریزی میں اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔ اس سے گذارش کرتا ہوں کہ اپنے بدن کی رعنائیوں پر تھوڑا سا اختیار رکھے لیکن وہ مجھ سے کچھ اس طرح اردو میں مخاطب ہوتا ہے۔

"نکو نکو انگریجی میں نکو۔ نیئں آتا' جرا جرا اردو میں آتا"

میں اردو کی اس مقبولیت سے دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں اس سے التجا کرتا ہوں کہ وہ ٹھیک سے بیٹھے ـــــ میرے ہاتھ کے اشارے پر اس کی آنکھیں اپنا نیم برہنہ منظر دیکھتی ہیں اور وہ بڑے بے نیازی سے دھوتی برابر کر کے بیٹھ جاتا

ہے۔ جیسے یہ تو معمول کی بات تھی، لیکن مجھ پر جو بیت گئی ہے سو بیت گئی ہے۔

گنتوڑ کے اس مل مالک کے مقابل اس کا ایک ساتھی جو وہیں کا تعین دار ہے بیٹھا ہوا ہے۔ دونوں ہی بدمستی کی حد تک پیئے ہوئے ہیں۔ جب میں اپنی سیٹ سنبھال لیتا ہوں تو مل مالک مجھ سے قریب ہو کر پوچھتا ہے۔

"یاں تہندی باجار کی منجیلا بھان کو آپ جان کو ہیں"۔؟

وہ جو منجیلا بھان کی رٹ لگائے ہوئے ہے وہ یقیناً کوئی طوائف ہے یہ بات ابھی ابھی میری سمجھ میں آئی ہے کیونکہ اس نے مہندی باجار کا حوالہ بھی دیا ہے۔

محبوب کی مہندی جسے آج کل لوگ مہندی بازار بھی کہنے لگے ہیں۔ اجازت یافتہ طوائفوں کی کالونی ہے۔ رائس مل کا مالک وہیں کی کسی منجیلا بھان کی بات مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

——— وہ کہہ رہا ہے

"بنگلہ پہ رہاتی ہے ——— آہا ——— آہا"

گویا اس آہا میں ——— اس کا حسن، اس کی آواز، اس کی چنچلتا، ہر شئے کی تعریف ہے۔ جذبات کے لئے ہاتھ کے مخصوص اشارے کے ساتھ مل مالک کے ادا کئے ہوئے اس لفظ "آہا" کی معنوی بلاغت کو میں نے محسوس کر لیا ہے اور اس کی ایک ادا پر اس میں دلچسپی لینے کو مجبور ہو گیا ہوں۔

نوجوان مرد اور ادھیڑ عورت جو مجھے اب جوان نظر آنے لگی تھی۔ ابھی

گئے نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے شاید اپنا بل ادا کر دیا ہے۔ میں نے ان کو ہال کے بیچ سے گذرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن جانے کب وہ لوٹ آئے ہیں یا پھر ہال سے باہر گئے ہی نہیں ہیں۔ اب یہ دونوں دوسرے کونے میں مجھ سے ذرا فاصلے پر ایک اور جوڑے کے ساتھ بیٹھے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اس نئے جوڑے کی پشت میری جانب ہے۔ میں چہرے نہیں دیکھ پاتا ہوں۔ چہرے جو کبھی کبھی کتاب کی طرح نظروں کے آگے کھل جاتے ہیں۔

میں رائس مل کے مالک کو بتا دیتے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں کہ میں تھنڈی بازار کی کسی منجیلا بھان کو نہیں جانتا۔ لیکن اس کے دل و دماغ پر منجیلا بھان کا قبضہ ہو چکا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ اس کے ایک دوست کے ساتھ وہ منجیلا بھان کے بنگلے پر بہت دن پہلے گیا تھا۔ آج اس کے اسی دوست نے کوالٹی بار میں اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب وہ وہاں نہ آیا۔ تو یہ دونوں اس کی تلاش میں یہاں آگئے ہیں۔ کیوں کہ بار کے آخری اوقات میں وہ اکثر "من جو" آتا ہے۔

پھٹی ہوئی بوشرٹ والا جاذب نظر میخوار کاؤنٹر سے اٹھ کر لاوٹری کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا چہرہ فروغ مئے سے گلستاں بنا ہوا ہے۔ جب وہ ہال کے درمیان سے ہو کر گذرتا ہے تو میں غور سے دیکھتا ہوں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر اس طرح باندھ رکھے ہیں کہ بش شرٹ کا پھٹا ہوا حصہ اس کے ہاتھوں کے نیچے چھپ گیا ہے۔

بھرے ہوئے ہال میں بے شمار اور بھی لوگ ہیں اور ہر ایک میں دلچسپی لینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ پھٹی ہوئی بوشرٹ والا

میخوار اپنی دانست میں شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ سب کی نگاہیں اس کی زبوں حالی کا تما
دیکھ رہی ہیں۔ میری نظروں سے اوجھل ہونے تک اس احتیاط سے اپنی بچی ہوئی بو
اس نے چھپا رکھی ہے جیسے دنیا بھر کی نگاہیں صرف اسی کا تعاقب کر رہی ہیں۔

ایک بہت ہی پستہ قد آدمی ہال سے گذر کر رائس مل کے مالک کے پا
اسطرح آ رہا ہے کہ کوئی اسے دیکھتا ہے۔ کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ اس آنے والے
قد کی کرامت ہے۔ جو وہ نظروں کے سامنے رہ کر بھی صوفوں، میزوں اور کرسیوں کے
پیچھے سے یکایک نمودار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

——— رائس مل کا مالک اور اس کا ساتھی اس کو دیکھ کر چیخ پڑتے
ہیں ——— پھر وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس چھوٹے قد کے کاندھی
کیپ اوڑھے ہوئے شخص سے مجھے ملاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"آیا جی ——— ارے اوچ ہے"۔

میں اس آدمی سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہوں ——— "آپ انھیں ان کی
منجیلا بھان کے پاس لے جائیں گے نا۔؟"

وہ کھل کر ہنستا ہے۔ مجھ پر انکشاف کرتا ہے کہ منجیلا بھان دراصل
جمیلن بائی کی بدبختی ہے۔

ارے اوچ ——— خالہ ——— آہا۔

رائس مل کا مالک، اس کا ساتھی، نیا آدمی اور میں سب ہنستے ہیں،
اور یہ لوگ چلے جاتے ہیں۔

لمحے بھر کے لئے جمیلن کی رعنائیاں، شوخیاں، لن ترانیاں ایک پیکر

سیمی بن کر میرے قریب آجاتی ہیں ــــــ وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے پوچھتی ہے۔
"تم اپنی دوسری کتاب میرے نام سے منسوب کروگے تا جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی"؟

میں جمیلن کی بزم تصور میں زیادہ دیر تک رہنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ گویا وہاں سے بھاگ آیا ہوں۔

جاذب نظر مئے خوار ہال کے درمیان سے پھر کاونٹر کی جانب لوٹ رہا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ اسی احتیاط سے اپنی پشت پر باندھ رکھے ہیں اور بوشرٹ کا پھٹا ہوا حصہ مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔ کاونٹر کے قریب جاکر بھی اس نے اپنے ہاتھ اسی طرح پشت پر لٹکا رکھے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ ایک کونے کی کرسی کی آڑ میں بیٹھ گیا ہے۔ اور اس وقت تک اپنے ہاتھ پشت سے الگ نہیں کئے ہیں جب تک کہ اس نے اپنی پشت دیوار کی جانب نہیں کردی۔ بیرا کو آواز دیکر وہ اپنا گلاس کاونٹر سے اپنی میز پہ منگوالیتا ہے۔

بھری بزم میں اپنی زبوں حالی کی تشہیر کرنے کے بعد اب یہ شخص آخر کن نگاہوں سے یہ سب کچھ چھپا رہا ہے ــــــ وہ کون ہے جو اس کی شخصیت میں اب تک سو رہا تھا اور اب بیدار ہو رہا ہے ــــــ جو کہ باکس کے پاس رکھا ہوا یہ زندہ پورٹریٹ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ وہ تصویر تو محسوسات کی تصویر ہے جو "من جو" بار کے ایک چوتھائی ہال پر دیوار سے لگی ہوئی ہے۔ اور جو میری سمجھ میں آگئی ہے۔ لیکن میں اب اس زندہ تصویر کی دھجیاں شخصیت کو کن خط و خال سے ابھاروں۔ کن

نقوش سے اجاگر کروں؟ کونسا رنگ بھروں کہ پھٹی ہوئی بوشرٹ سب کی نگاہوں سے چھپ جائے اور دل کے زخم مہک اُٹھیں۔ کاش میں بھی کوئی آرٹسٹ ہوتا اور اس آدمی کے پورٹریٹ کے برابر اپنا پورٹریٹ رکھ کر اس سے کہتا ــــ پہچانو ــــ تم کون ہو؟ میں کون ہوں۔

# کھڑکیاں

میں اپنی نانی کے پاس کچھ ہی دن ہوئے شہر آئی ہوں۔ ضلع میں میں نے
اپنی ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرلی ہے۔ یہاں مجھے کالج میں داخلہ مل گیا ہے۔

شام کو اپنی نانی کے ساتھ گھومنے پھرنے چلی تھی۔ بڑی احتیاط سے پھونک پھونک
کر قدم دھر رہی تھی۔ جیسے زمین نہ ہو ڈولتا بجرا ہو اور میں اپنا توازن کھو بیٹھوں۔ آدمیوں
کی اتنی بھیڑ میں نے سنی تھی، دیکھی کہاں تھی۔ رنگ برنگ کی موٹریں، بسیں، جیسے آنکھوں میں
گھسی آتیں۔ اسکوٹروں پر اُڑتی ہوئی لڑکیاں مجھے پریاں سی لگیں۔ میں نے تصور ہی تصور میں کتنی
ہی بار ان کی جگہ خود کو دیکھا۔ شہر کا بڑا بازار اونچی عمارتوں کی ایک تماشا گاہ ہے جہاں میں خود
کو بھول گئی ہوں۔ انجانے میں بس اتنا احساس ہے کہ میری نانی نے میرا ہاتھ تھام رکھا ہے
اور میں زمین پر چل نہیں رہی ہوں اڑ رہی ہوں۔

وہ پاؤں جو ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر اُڑتی ہوئی تتلیوں کی طرح دوڑتے تھے

تھ پر ڈھنگ سے اٹھنا بھی بھول گئے ہیں - وہ آنکھیں جو دھان کے لہلہاتے
رنگی، ہرے بھرے ٹیلوں کی شادابی، بہتی ہوئی ندیا کی روانی، ٹھنڈک، صبح کی
دھوپ کا سنہرا پن، شام کی فضاؤں میں بکھرا ہوا کاجل اپنے گاؤں سے سمیٹ
ب بڑے بڑے پوسٹرس اور اشتہارات اور دوکانوں کے بورڈ پڑھ کر حیران ہو رہی
یہ موٹریں، یہ اسکوٹروں کی پریاں، یہ سجی ہوئی دوکانیں، یہ آدمیوں کا چڑھتا ہوا دریا
ے آج کے آج سارا شہر دیکھ ڈالوں - آنکھیں کتنی بڑی نعمت ہیں ان کی جوت
س طرح جیتا ہوگا - میں لمحہ بھر کو اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور میرا رواں
، اٹھتا ہے - اندھیرے —— اطراف —— اندھیرے —— دور
ے —— اُف -

منقش صراحیوں اور آب خوروں کی دکان سجائے ایک لحیم شحیم عورت ہر راہ گیر
رہی ہے - فٹ پاتھ پر اس نے ایسی جگہ چُن لی ہے کہ اس کے سجے ہوئے
ں پر راستے کا بلب ہر رات چمکتا ہوگا اور بجلی کا کھمبا اس طرح بھی اس کی
ر رہا ہے کہ وہ اس شانِ استغناء سے مسند نشین ہے جیسے فٹ پاتھ پر نہیں
ب پر متمکن ہے - راہ گیروں کا منہ تکنے میں اس کی آنکھیں اپنی بے بضاعتی کا
کر رہی ہیں بلکہ فربہی کا بوجھ ہے جو تکی ہوئی نظروں کو اُٹھنے جھکنے سے
ے ہے -

میری نانی ایک صراحی کو الٹ پھیر کے دیکھ رہی ہے - یہ نقش کب تک پانی
گے پھر اس نے اپنی انگوٹھی کے نگ کو ہتھیلی کی طرف گھما کر صراحی کو بجانا
ہے آواز بتا رہی ہے کہ صراحی میں کہیں بال نہیں ہے -

کوئی میرے برابر سے ہو کر مقابل میں آگیا ہے۔ جھک کر اس نے بھی ایک صراحی اٹھالی ہے لیکن وہ صراحی کو دیکھنے کے بہانے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری نظریں اس کی نظروں سے چار ہوئیں اور میں نے نظریں جھکالیں۔ لیکن میں چوری چھپے اسے دیکھ رہی ہوں وہ تو بس میرے چہرے پر ٹکٹکی جمائے ہوئے ہے میری ناک کے نیچے اور ٹھوڑی کے او پسینے کے قطرے چمکنے لگے ہیں میں چاہتی ہوں کہ یہاں سے نکل چلوں لیکن میری نانی نے پہلی صراحی رکھ دی ہے اور دوسری اٹھالی ہے اور پھر الٹ پھیر کر ٹھونک بجا کر دیکھنے میں منہمک ہے۔ میں بھی اب صراحی میں دلچسپی لیتی ہوں تا کہ اس طرح مبہوت کھڑے رہ کر اپنے ذہنی دیوالیہ پن اور اس بوکھلاہٹ کو عیاں ہونے سے بچالوں ——— لیکن ایسا بھی کیا دیکھنا کہ بس پلک ہی نہیں جھپکتی ——— میں نے کن انکھیوں سے اس نوجوان کو پھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہر کر جیسے سب کچھ بھول گئی ہیں۔

میرے پاس صورت ہے جسم ہے۔ عمر ہے، آنکھیں ہیں ——— کسی لڑکی کو اور چاہیئے بھی کیا ——— مجھے بے شمار آنکھوں نے دیکھا ہے ——— اور میں خوش ہوں کہ میں دیکھے جانے کے لائق ہوں ——— عورت دزدیدہ نگاہوں سے دیکھی جائے تو اندر ہی اندر وہ پھول کی طرح کھل جاتی ہے لیکن چہرے پر اس شگفتگی کو اس وقت تک آنے نہیں دیتی جب تک کہ وہ بار بار نہ دیکھی جائے۔ میں اس بات کو مانتی ہوں لیکن مجھے تو کبھی ایسی آنکھوں سے سابقہ پڑا ہے جو مجھے دیکھ کر کچھ اور دیکھنا ہی بھول گئی ہیں۔

میں نے نانی کو ٹھوکا دیا ——— "لے بھی چکو نا"

لیکن اس نے صراحی پسند کر کے ایک طرف رکھ دی ہے اور ایک آب خورہ اٹھالیا ہے اور وہ مجھے اس طرح دیکھے جا رہا ہے جیسے اس کی آنکھیں میرے وجود کو

تلاش بھی کر رہی ہیں، جھٹلا بھی رہی ہیں۔

اپنے ضلع میں اسکول آتے جاتے مجھے کتنی ہی آنکھوں نے دیکھا ہے ——
اپنے گاؤں میں تو خود میری آنکھوں نے کتنی ہی آنکھوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہرا دیا ہے —— لیکن یہ انداز نظر ہی کچھ اور ہے۔ یہ نظر بجائے خود دیدنی ہے۔ میں تو پشیمان سی ہو چلی ہوں۔ جیسے میرا اپنا کچھ دوش ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں ان نظروں کی زد میں کیوں آ گئی۔

ایک عجیب سا خطرہ مجھ پر طاری ہونے لگا ہے۔ بوکھلاہٹ اور پشیمانی آہستہ آہستہ خوف سے بدلنے لگے ہیں —— اور میں نانی کے پیچھے سے گھوم کر ان کی دوسری جانب پہنچ گئی ہوں تاکہ خود کو محفوظ محسوس کر سکوں۔ لیکن وہ آنکھیں سرخ لائٹ کی طرح مجھے فوکس میں لئے میرے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہیں۔

میری نانی نے وہ صراحی خرید لی ہے جو پہلے اس نے پسند کی تھی، باقی پیسے لوٹانے کے لئے جب موٹی عورت نے الٹی سانس لے کر نفی میں گردن ہلا دی تو پھر مجھے تکنے والی آنکھیں گویا ہوئیں۔

"لیجئے میں دے دوں؟"

نانی نے نوٹ بڑھایا تو اس نے پیش کیا۔

نانی نے اصرار کیا اور ہم چھٹکارا پا کر آگے بڑھنے لگے۔

شہر میں کسی شے کو بھولنے میں منٹ دو منٹ سے زیادہ دیر نہیں لگتی ——
یہی آنکھیں مجھے اپنے گاؤں میں ملتیں تو کوئی فیصلہ کن بات ہو ہی جاتی۔ لیکن یہاں سمنٹ کی سڑکیں کسی مسافر کا پاؤں پکڑنے کی زحمت ہی نہیں کرتیں —— یہاں نہ نقش قدم بنتے نہ

گردکارواں ہے ـــــ آدمی چلتا ہے، چلتا ہے، نہ پیچھے آنے والوں کے لئے کچھ چھوڑتا ہے نہ خود اس کے لئے کسی کے نقش کف پا چمک اٹھتے ہیں ـــــ اور پھر بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے ہوئے ہاتھ پھر نہیں ملتے۔

میں اسی لئے تو مطمئن تھی کہ چلو آگے بڑھ آئی ہوں۔ اب نہ پیچھے کچھ ہے اور نہ سامنے کچھ۔

نانی نے کتنی ہی چیزیں مجھے بتلائیں۔

اور جب میں چلتے پھرتے بنگلے میں سوار ہو گئی تو میرا تن من ڈول رہا تھا۔ پیچھے چلتے ہوئے راہ گیر سائیکلیں، رکشے، موٹریں سب ہی کچھ نیر ہم سے الگ سے ہے تھے۔ مکانوں کی چھتیں گنجے کی چندیا کی مانند چمک رہی تھیں۔

رکتی، بڑھتی، تھم تھم کر جب ڈبل ڈک کہیں ٹھہر گئی تو نانی نے مجھے جیسے کھینچ لیا ہم دونوں اتر پڑے۔

"یہ آندھرا بینک ہے۔ یہ ویمنس کالج"

میں سوچ رہی ہوں -میرا تو یہیں یہ حال ہو رہا ہے ـــــ لوگ دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں کیا کرتے ہوں گے۔

ٹھیلوں کی قطار میں میری نانی ایک جگہ ٹھہر گئی ہے۔ اس نے کہا "بتا کیا کھائے گی؟ پھر خود ہی چاٹ بنانے کے لئے کہہ دیا۔

میں ہو ہو ـــــ سو سو کرتی چاٹ کھا رہی ہوں۔

میری نانی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میرے گال سرخ ہو رہے ہیں۔

میں تو اپنے بالوں کی اس لٹ پر جھلا رہی ہوں جو چاٹ کی دونے میں آ گری ہے

میں بے بس ہوں - ایک ہاتھ میں دو سبب ہے ایک جھوٹھا ہے - نانی نے مسکرا کر میری لٹ کو اپنے پلّو سے صاف کیا اور پیچھے بالوں میں اڑس دیا -

میں پھر مزہ لے رہی ہوں ـــــ سو سو ـــــ ہم ہم -

"اب یہ پکوڑی کھا لے"

پھر میں اور نانی غپ چپ کھانے لگے ـــ بٹانے پھر اغپ چپ میں منے منہ میں رکھا اور مزہ لینے لگی ـــــ نانی نے کہا ـــــ "تجھے اس ہوٹل سے کافی پلاؤں تو نیا میڈیکل کالج بتاؤں -"

ہوٹل پر کافی بورڈ کی بڑی سی تختی لگی ہوئی ہے - ایک آدمی دھلے دھلائے جگ مگ کرتے صاف شفاف چھوٹے سے بیرل کی نلکی کھول کر کافی بھر رہا ہے اور ایک آدمی کوپن جمع کر رہا ہے ـــــ نہ اس کے ہاتھ کو چین ہے ـــــ نہ اس کے ہاتھ کو -

میں نے دوسرا غپ چپ منہ میں رکھتے ہوئے محسوس کیا جیسے پھر کسی خوف کی پرچھائیاں میرے ذہن پر پڑنے لگی ہیں -

میں نے ادھر اُدھر جب نظریں گھمائیں تو شاید میری آنکھوں نے اُچٹتے اچٹتے کوئی ایسا منظر دیکھا ہے ـــــ جس سے میں کچھ کچھ خائف ہو گئی تھی -

میں پھر ایک پانی بھرا غپ چپ ٹھیلے والے کے ہاتھ سے لے رہی تھی کہ میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار ہوئیں - وہ پھر اسی ڈھنگ سے مجھے تک رہا ہے - اب کی بار اس نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں چھپا رکھا ہے - شاید چاہتا ہے کہ وہ مجھے دیکھتا رہے لیکن میں اسکو نہ دیکھ سکوں - لیکن میں نے اس کو دیکھ لیا ہے - میں نے اپنی نانی کو بتلا دینا مناسب سمجھا کہ وہ آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے -

میں نانی کے قریب ہوگئی۔ انھیں صورت حال سے واقف کرادیا۔ اور یہ بھی بتلادیا کہ وہ نوجوان کہاں کھڑا ہے ——— نانی نے جھٹ پٹ ٹھیلے والے کے پیسے ادا کئے اور میرا ہاتھ اس مضبوطی سے تھام لیا ——— جیسے میں خود بھاگ کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔

ہم نے میڈیکل کالج کی طرف بڑھے تو میری نانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور میں نے کن انکھیوں سے۔

وہ بھی ہمیں بڑھتا ہوا دیکھ کر بھیڑ میں کہیں غائب ہوگیا۔ لیکن میں اور نانی نے میڈیکل کالج کے گیٹ میں داخل ہوئے تو وہ جیسے خوش آمدید کہنے کھڑا ہے۔

ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر کچھ وہ بھی بوکھلایا۔ میرے تو قدم زمین میں گڑ گئے ہیں شہر کی دھرتی جیسے کسی تہمت کا انتقام لے رہی ہو۔

نانی اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے نظروں ہی سے چبا کر تھوک ڈالے گی لیکن وہ ہماری ان ساری کیفیات سے بے نیاز ہے۔ ہم پر جو بیت رہی ہے سو بیت رہی ہے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ جو کچھ بیت رہی ہے سو اسی پر بیت رہی ہے۔

ہم آگے بڑھ گئے تو نانی نے کہا۔

"منہ سے پھوٹتا بھی تو نہیں ——— گونگا ہوگا موا۔"

میں نے نانی کو یاد دلایا کہ گونگا ادنگا نہیں ہے ——— اس نے صراحی خریدتے وقت ریزگاری بھی گنی تھی۔ نانی کو یاد آیا تو وہ جھلا کر بولی۔

"ہاں جی یہ موا تو بولتوں کی بولتی بند کرے ہے"۔

نانی کی اس بے بسی پر میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی ——— لیکن خوف کی پرچھائیاں

گہرے سایوں میں بدل رہی تھیں۔

ہم دوسرے گیٹ سے نکل کر بس اسٹینڈ کی طرف چلے ہیں تو نانی بڑی چوکنی ۔ وہ پلٹ پلٹ کر اور دائیں بائیں نظریں گھما کر برابر دیکھے جا رہی ہے۔ کچھ دیر بعد نے میرا ہاتھ دبا کر کہا —— "وہ پیچھے پیچھے آرہا ہے۔"

اسی اثنا میں بس سامنے اسٹینڈ پر آکر رکی تو ہم تیز تیز چل کر "کیو" میں جا ملے نے مجھے آگے کر دیا اور خود پیچھے ہو گئی کہ میں نظروں کے سامنے ہی رہوں۔

جب ہم بس میں سوار ہوئے تو اوپر کی منزل پر چڑھتے چڑھتے ہم نے دیکھا کہ ی کیو میں کھڑا ہے اور بس میں سوار ہونے والا ہے۔

راستہ کس طرح گذر گیا مجھے کچھ کم کم احساس ہے۔ نانی اس قدر پریشان ہے خود وہ ابھی ابھی شہر آئی ہے۔ اس کی اس پریشانی سے میں خائف بھی ہو گئی ہوں اور بھی —— خائف اسلئے کہ آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں اداس اسلئے کہ اگر وہ پیچھا یں تو جانے کب تک میں شہر میں گھومتی پھرتی۔ یہاں تک کہ نانی تھک جاتی اور اس رشل ہو جاتے۔ مجھے تو کچھ نانی پر بھی غصہ آرہا ہے۔ وہ زیادہ ہی گھبرائی ہوئی ہے جب اس کی بات بتلائی تھی تو میں سمجھتی تھی کہ نانی ان آنکھوں کو شعلہ بن کر جھلس ۔ لیکن وہ جیسے سٹھیا گئی ہے۔

ہمارے پاس گاؤں میں کسی لڑکی کی آنکھیں اگر وہ جاگتی رہیں تو دنیا بھر کا کر سکتی ہیں۔ یہاں شہر میں ایک مرد کی دو آنکھوں نے ہمارے حواس گم کر دیئے ہیں یکھ رہا ہے تو دیکھتا رہتا —— میرے لئے تو یہ نئی جگہ تھی —— اسی لئے تو اس دیکھے جانے کو بھی گوارا کئے ہوئے تھی۔ ہمارا گاؤں ہوتا، یا پھر اس شہر سے

میں مانوس ہوتی تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی کہ دیکھو میری آنکھوں میں تمہارے لئے کتنی نفرت ہے۔

ہم گھر کے قریب پہنچ گئے اور نانی نے مجھے اٹھنے کو کہا —— ہم بس پر سے اتر پڑے تو نچلی منزل سے وہ بھی اتر پڑا۔ وہ ہمارا ہی منتظر تھا —— ہم گھر کی جانب چلنے لگے تو وہ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا —— پاس سے گذرتے وقت میں نے بیزار لگا ہوں سے اسے دیکھا بھی۔ لیکن وہ اس قدر مبہوت کھڑا تھا جیسے جادو کے اثر سے نیم جاں ہو ہم آگے بڑھ گئے تو نانی نے پلٹ کر دیکھا۔

"وہ آرہا ہے ——" نانی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"آنے دو موئے کو —— تم ڈرتی کیوں ہو ——" گھر قریب آگیا تھا تو مجھ میں بھی ہمت آگئی تھی ورنہ نانی نے سٹھیا کر رکھ دیا تھا۔

گھر کے دروازہ تک وہ برابر پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میں تو اس جھپک سے اندر چلی گئی جیسے کوئی پردہ نشین خاتون سواری سے اتر کر راہ گیر کی نظر سے بچتی ہو —— نانی پیچھے آئی تو کہنے لگی —— موا کھڑا ہے۔ تیرا ماموں آجانے دے ہڈیاں تڑا دوں گی۔"

میں بھی سوچ رہی ہوں کہ شہر کی ریت نیاری ہے کوئی لڑکا لڑکی کو تاک رہا ہو تو لڑکی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور اپنے ماموں کے آنے کا انتظار کرتی ہے۔ گاؤں میں منٹ بھر میں وہ سمجھا دیتی ہے کہ مسافر راستہ بھٹک گئے ہو —— اس کنوئیں کا ٹھنڈا پانی تمہارے لئے نہیں ہے۔ راہ لو اپنی۔

ماموں آتے نہیں —— قفل کھلتا نہیں —— اس کہاوت کے مصداق نانی نہ مجھے بنگلے کی کھڑکی کھولنے دیتی ہے نہ سڑک کا نظارہ کرکے دل بہلانے دیتی ہے۔

ہمارے بنگلہ پر قطار سے تین کھڑکیاں ہیں۔ نانی کہتی ہے کہ جب جی نہیں لگتا تو وہ کھڑکی کھول کر بیٹھ رہتی ہے اور اس طرح گھنٹوں گذر جاتے ہیں۔ میرا ماموں بھی کبھی کبھی دوسری کھڑکی میں بیٹھ رہتا ہے۔ اس کا گھنٹوں نہیں تو کچھ نہ کچھ وقت گذر جاتا ہے تیسری کھڑکی ایسے میں بند رہتی ہے یا پھر کھلا بھی رہتی تو خالی رہتی۔ اب یہ میرے حصے میں آئی ہے۔

پرانی وضع کے اس مکان میں ان کھڑکیوں سے صرف ہوا اور روشنی ہی داخل نہیں ہوتی بلکہ زندگی داخل ہوتی ہے۔ کھڑکیاں بند کرلی جائیں تو کمرے کی چھت پر بڑا سا کتبہ لگا دیا جاسکتا ہے۔

قبر جس میں تین آدمی دفن ہیں۔

مکان دراصل ہمارے قبضہ میں ہے نہیں ـــــ نچلا حصہ سارے کا سارا ماموں نے کرائے پر دے رکھا ہے۔ یہ حصہ اچھا خاصا وسیع ہے۔ چار دالان، چار کمرے، دو چھوٹے برآمدے، دو حمام، دو پخانے، ان دو حمام اور دو پخانوں میں سے ایک حمام اور ایک پخانہ تو ہمارے لئے مختص ہے۔ ماں نے دونوں ہی کے دروازوں پر تالے ڈال رکھے ہیں۔ یہ تالے لگ بھگ ماموں ہی کی عمر کے ہوں گے۔ ان کا کام لوگوں کو چکر دینا ہے۔ کوئی مائی کا لال ذرا سا جھٹکا دے تو پٹ سے کھل جاتے ہیں لیکن ہمارے کرایہ داروں پر ماموں کا بڑا رعب ہے۔

تو اس نچلے حصے میں چھ خاندان بستے ہیں۔ ایک ایک دالان میں ایک ایک خاندان آباد ہے۔ ایک خاندان نے دو کمرے لے رکھے ہیں اور ایک فیملی نے تو بچے کچھ کے ایک ہی کمرے پر اکتفا کیا ہے۔ ایک کمرہ مقفل ہے اور ایسا لگتا ہے کہ مدت سے اس کا

قفل کھولا نہیں گیا۔ میں نے ابھی اس کمرے کے مقفل رہنے کی وجہ نانی سے پوچھی نہیں۔
اِدھر اُدھر کچھ ایسا سُنا تھا کہ کوئی نیا دولھا اپنی نئی نویلی دلہن کو لیکر یہاں اترا تھا۔ اس رات بھر کی تو بات تھی۔ صبح ہوئی تو دولھا کی لاش کمرے میں اکیلی تھی اور دلہن غائب تھی ——

عورتیں کہتی ہیں کہ انہیں دلہن کی پرچھائیاں آج بھی اس کمرے کا طواف کرتے ہوئے راتوں کو دکھائی دیتی ہیں۔ دلہن بے وفا نہ تھی۔ اس کو اغوا کیا گیا ہے۔
مرد کہتے ہیں کہ انہیں دولہا کی بیچیوں کی آوازیں اور ساتھ ساتھ دلہن کے قہقہوں کی آوازیں صاف سُنائی دیتی ہیں —— میں سمجھتی ہوں کہ نہ عورتیں کچھ دیکھتی ہیں نہ مردوں کو کچھ سُنائی دیتا ہے —— ایک دوسرے سے عہد وفا استوار کرنے یا جھوٹ موٹ اپنی اپنی محبتوں کا یقین دلانے کے لئے لوگ اس کمرے کے قصہ کو لے بیٹھے ہیں۔ بہر حال میں اپنی نانی سے اس مقفل کمرے کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ایک بے چینی سی خود میں ضرور پاتی رہوں —— لیکن اب تو ان دو کھلی آنکھوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، پہلے ان سے نپٹ لوں۔

گھر کے دروازے میں داخل ہوتے ہی سیدھی جانب سیڑھیاں ہیں جو ہمیں اپنے بنگلے پر لے جاتی ہیں۔ بنگلے پر صرف یہی ایک کمرہ ہے جس کی تین کھڑکیاں ہیں اور ہم تین رہنے والے۔ ہمارے فرش کے بالکل نیچے جو کرایہ دار ہیں وہ گویا پختہ چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ بقیہ جتنے دالان اور کمرے ہیں ان کی چھتیں کویلو کی ہیں۔
ہمارے ضلع میں جو جیل خانہ ہے —— جانے کیوں مجھے اپنے گھر کو دیکھ کر بار بار اس کا خیال آتا ہے۔ پہلے پہلے تو مجھے اس مماثلت کا کچھ احساس نہ ہوا —— پھر

یکایک ذہن میں کوئی کوندہ سا لپکا اور مجھے خیال آیا، جیل کے بڑے سے چوکور وسیع احاطے کے ہر گوشے میں چار کمرے بلندی پر بنائے گئے ہیں ـــــ جن میں سنتری پہرہ دیتے ہیں اور سارا جیل خانہ ان کی نظروں کی زد میں رہتا ہے۔ ہمارا یہ گھر بالکل اسی طرح کا چھوٹا سا جیل خانہ ہے ـــــ ماموں سنتری ہے اور نانی شحنۂ شہر۔

اپنے ان کرایہ داروں کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کو نانی کبھی کبھی اس سمت کی کھڑکی کھول لیتی ہے جو گھر کے اندر کھلتی ہے۔ کبھی نیچے کوئی بلوہ ہوتا ہے، کرایہ دار آپس میں لڑ پڑتے ہیں یا عورتیں تو تو میں میں کرتی ہیں تو نانی کی اس اکلوتی کھڑکی کے پٹ تڑسے دھڑ سے کھل جاتے ہیں اور لڑنے جھگڑنے والوں کی نظریں انصاف کی طالب ہو کر نانی کی جانب اُٹھ جاتی ہیں۔ اب چونکہ یہ کھڑکی بند ہے۔ ہمارے بنگلے میں اندھیرا ہے۔ سورج کی اکا دکا کرنیں کسی سوراخ سے داخل ہوئی ہیں تو فرش پر چمکتی ہوئی سونے کا سکہ بن گئی ہیں۔

دن کا ابھی بہت بڑا حصہ باقی ہے ـــــ میں سوچ رہی ہوں ـــ وہ شخص ہمارا پیچھا چھوڑے تو نانی کو اکسا کر، بہلا، منا کر، ہمت دلا کر پھر گھومنے پھرنے کے لئے نکل پڑوں۔

میں نے آخر تنگ آکر نانی سے کہا ـــ "کھڑکیاں کھول دو نانی ـــ دیکھیں بھی وہ کھڑا ہے یا چلا گیا ـــ وہ کوئی شیر تو ہے نہیں ـــ جو ہمیں کھا جائے گا"

"ایسے مرد شیر سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں پگلی ـــ" نانی نے کہا۔

اس کی آواز مدھم ہو گئی ـــ کہنے لگی۔

"تجھے کچھ پتہ ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے دن دھاڑے ایک عورت کو دو مرد

سڑک سے اٹھا کر بھاگے ہیں —— پھر ان میں چار مرد اور مِل گئے —— اور آج تک وہ عورت لاپتہ ہے۔ اس کا میاں ہے، اس کے بچے ہیں —— اور پولیس تلاش کر رہی ہے۔"

میری عقل ٹھکانے لگی —— میری بدھی سدھر گئی —— تو وہ آنکھیں جو مجھے اس طرح تک رہی تھیں جیسے اپنا آپا بھول بیٹھی ہوں۔ اپنا پرایا بھول بیٹھی ہوں۔ —— وہ اتنی چال باز ہو سکتی ہیں —— !!

میں سوچ رہی ہوں کہ ماموں آئیں گے تو اس موئے کو پٹتا ہوا دیکھ مجھے کس قدر مزہ آئے گا۔ کاش ایسا بھی ہو سکتا کہ میں اور نانی اس موئے کو سڑک پر سے اٹھا کر کہیں لے جا سکیں۔

نانی نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر شاید ہمت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے تینوں میں سے ایک کھڑکی کھول لی ہے۔ یہ کھڑکیاں بنگلے کے فرش سے صرف ایک فٹ اونچی ہیں۔ اور قد آور سے قد آور آدمی بھی اطمینان سے ان پر بیٹھ کر سڑک اور بازار کی سیر کر سکتا ہے۔

نانی نے مگر ایک ہی پٹ کھولا ہے اور دوسرے پٹ کی آڑ میں بڑا بے چین ہو کر سے نیچے سڑک پر دیکھ رہی ہے۔

"بجلی گرے تجھ پر، منہ جلے تیرا، آنکھیں پھوٹیں تیری" نانی بڑبڑانے لگیں —— "بس دروازے پر ٹکٹکی لگائے کھڑا ہے موا۔ آنے دے تیرے ماموں کو۔ دیکھ تو بھلا کیا کرواتی ہوں نواب کے جنے کو۔"

"بس اس کی آنکھیں پھڑوا دو نانی۔ اور چھوڑ دو دنیا بھر کے اندھیرے میں

بھٹکنے کے لئے۔ اس کے لئے یہی بڑی سزا ہے کہ ٹھیک اسی طرح کہ جیسے کوئی شہزادی کسی غریب کی جسارت پر کوتوال شہر کو اس کی آنکھیں نکلوا دینے کا حکم دیتی ہے۔

لیکن میں چاہتی تھی کہ ذرا اس کو نظر بھر کر دیکھوں بھی۔ آخر وہ جس کی میرے لئے ٹھکائی ہونے والی ہے۔ اسے میں بھی تو دیکھوں کہ اس کا چہرا ہی یاد رہے۔

میں نے بھی نانی سے پوچھے بغیر ہی دوسری کھڑکی کھول لی۔ لیکن اسی احتیاط سے ایک پٹ بند رکھا اور پٹ کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔

"وہ کہاں ہے نانی؟"

نانی نے مجھے بتایا "وہ رہا ہوا۔ درزی کی اس دوکان کے چھجے کے نیچے۔ ہاں وہی ابھی ابھی جس نے ہاتھ پر گھڑی دیکھی ہے"۔

وہ تو گھڑی دیکھ دیکھ کر انتظار کئے جا رہا ہے جیسے کسی سے ملاقات کا وقت لے رکھا ہو اور بے چین ہو۔

پھر ہم نے دیکھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ نانی تو بس اوسان کھو بیٹھی۔ اس نے لپک کر وہ کھڑکی کھول لی جو گھر کے اندرونی حصے میں کھلتی ہے اور جہاں سے نانی کرایہ داروں پر کوتوالی کرتی ہے۔ اس کھڑکی سے دروازہ بہ آسانی بائیں جانب نظر آتا ہے۔

لیکن وہ گردن جھکا کر سوچ میں گم لوٹ رہا ہے اور میں اسے لوٹتا ہوا دیکھ رہی ہوں اور میرے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ اب میں نے اطمینان کا سانس لے کر کھڑکی کھول لی ہے لیکن اس نے چلتے چلتے پلٹ کر اس طرح میری جانب دیکھا ہے جیسے میری آواز پر چونک اٹھا ہو۔ اس کی نظریں تو جھکنے کا موقع دیئے بغیر میری

نظروں سے چار ہو گئی ہیں اور میں زور سے کھڑکی بند کر کے غصّے کے اظہار کے بعد کھڑکی سے ہٹ آئی ہوں۔

ماموں ابھی نہیں آئے ہیں ورنہ میں اپنے عاشق کی مرمت ہوتی ہوئی دیکھ کر لطف اٹھاتی۔ یہ بھی عجیب طرح کی تشفی ہو گی کہ کوئی اپنے لئے جان کھو رہا ہے کر رہا ہے۔ اپنے لئے ہی کسی کے ہاتھوں ڈھنکا جا رہا ہے۔ اور میں اوپر کھڑکی میں بیٹھے اس کی نامرادی کا عالم دیکھ رہے ہیں۔

میں اور نانی چارپائی پر لیٹی ہیں۔ اور میں نانی سے باتیں کرتی کرتی سو گئی ہوں۔ ایک پل ہے اور میں بیچ پل پر تنہا کھڑی ہوں۔ نیچے ٹھاٹیں مارتا ہوا پانی ہے پھر پھر دیکھتے دیکھتے یہ پانی ساکن ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے منجمد ہو جاتا ہے۔ پھر سب غائب ہو جاتا ہے اور دو بڑی بڑی آنکھیں اس منجمد پانی کی جگہ رک جاتی ہیں۔ یہ بہت بڑی آنکھیں ہیں۔ پل پر کھڑی میں جھک کر دیکھ رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کہ ان آنکھوں میں کود پڑوں۔ لیکن یہ آنکھیں ڈبڈبانے لگی ہیں۔ پھر آنسو امڈ امڈ کر آنکھوں میں بھر جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے آنکھیں کہیں غائب ہو جاتی ہیں اور ساکن پانی پل کے نیچے اپنی گہرائی کو چھپاتا ہوا تا حدِ نظر پھیل جاتا ہے۔ یکایک پل میرے پیروں کے نیچے سے کھسکنے لگتا ہے۔ کچھ ہل چل سی محسوس ہوتی ہے۔ اور مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا ہے۔ پھر لمحے بھر کے لئے مجھے میڈیکل کالج کی عمارت دکھائی دیتی ہے جس کا ایک بڑا حصّہ منہدم ہو گیا ہے۔ پھر وہ پل جس پر میں کھڑی ہوں ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرنے لگتا ہے۔ اور میں چیخ مار کر پانی میں کود پڑتی ہوں۔ عین اس وقت یہ پانی آنکھیں بن جاتا ہے۔

اور ـــــ اور میں جاگ گئی ہوں۔ میری آنکھ کھل گئی ہے۔ نانی پیشانی پر ہاتھ رکھے مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ "بدخوابی ہوئی ہے کیا۔ تو ابھی چیخ پڑی تھی۔"

لیکن میں چارپائی سے نیچے کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔

آنکھیں کھلتی ہیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ تو چارپائی ہے جسے میں پل سمجھ رہی ہوں۔ اور میں ڈھونڈ کیا رہی ہوں آخر۔ یہاں تو صرف نانی ہے۔ اس کی آنکھیں ہیں۔ اور وہ تین کھڑکیاں ہیں جہاں سے صرف ہوا اور روشنی ہی نہیں زندگی بھی اس کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

میں مری ہوئی آواز میں نانی سے پوچھتی رہوں ـــــ نا، کہیں ماموں نے اسے پیٹا تو نہیں؟

اور پھر خود ہی اپنی آواز کی بازگشت سن کر خاموش ہو جاتی ہوں ـــــ اس لئے کہ نانی نے میری بات سنی ہی نہیں ہے۔

# کنول
# اور
# گندم

ناریل کے جھاڑوں کی جھنڈ میں کہیں کہیں گہرے سائے بکھرے ہوئے ہیں کہیں کہیں سورج کی کرنیں ان سایوں کی ٹھنڈک پر یلغار کر رہی ہیں اور زمین پر آ کر دھوپ کے دھبے بن گئیں ہیں۔ گرم دھوپ کے یہ روشن دھبے گھنے سایوں کی ٹھنڈک کو مجروح کر رہے ہیں اور مجھے ان کی بڑھتی ہوئی تمازت کے تصور سے وحشت سی ہو رہی ہے۔ ابھی تک ہوا کے جھونکوں میں خنکی ہے جس سے مجھے سکون حاصل ہو رہا ہے۔

میرے بالکل مقابل کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر ایک کیکر کا درخت کھڑا ہے جس کی پھلیاں سوکھی ہوئی ہیں۔ لیکن پتے بالکل ہرے بھرے ہیں۔ ایک مینا ابھی ابھی زمین پر اتر آئی ہے اور میرے وجود سے بے نیاز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس جھیل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جس کے سینے پر کنول ہی کنول تیر رہے ہیں مجھے اس مینا کا اسطرح زمین پر چلنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ اس زمین نے مجھ پر عرصۂ حیات

تنگ کر رکھا ہے ۔ میں چاہتا ہوں ۔ اپنے قدم اس زمین پر سے اُٹھالوں ، ہواؤں میں ڈولوں اور بلند ہو کر فضا کی وسعتوں میں کھو جاؤں اور یہ مینا سب کچھ چھوڑ کر زمین پر اتر آئی ہے ۔ میں نے ایک کنکر اس کی طرف پھینک دیا ہے اور وہ ذرا سا اُڑ کر رنگ برنگے پھولوں کے پودوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے ۔

کیکر کے درخت کے قریب ہی بمبو کے درخت ہیں اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک کیکر کا درخت اور ہے ــــــ مجھے پیپل کے گھنے سایوں کی تلاش ہے جو یہاں نہیں ہیں ۔ کیکر اور بمبو کے درختوں کے درمیان ایک بنچ پڑی ہے جو دھوپ کے گرم دھبوں سے اس وقت بھی محفوظ ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ بہت دیر تک محفوظ رہے گی ۔ اس بنچ کی پشت ہرے رنگ کی ہے ــــــ اس بنچ پر ایک آدمی گہری نیند سو رہا ہے ۔ اس کا رنگ کھلا ہے لیکن کپڑے بہت گندہ اور میلے ہیں ۔ اس نے اپنی بوسیدہ قمیص کے اندر شاید کوئی تھیلی چھپا رکھی تھی جو اس کی پشت پر بنچ کے نیچے جھول رہی ہے ۔ اس تھیلی کا رنگ زیادہ ہی گندا ہے جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے پسینے کی کھار کو اپنا روپ بنا لیا ہے ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس تھیلی میں جھانک کر دیکھوں کہ اس شخص نے کیا کیا رکھ لیا ہے ۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی انگلیاں بے تکلفی سے اس تھیلی میں گھسیڑ دوں ــــــ میرا یہ بھی جی چاہتا ہے کہ اس تھیلی سے اشرفیاں برآمد ہوں ۔ اور میں اسطرح حیرت زدہ ہو جاؤں جیسے بنیئے کی تجوری کو خالی دیکھ کر ہو سکتا ہوں ۔ یہ آدمی میری ان سوچوں سے بالکل بے خبر سو رہا ہے ۔ اور میلی کچیلی تھیلی بنچ کے نیچے جھول رہی ہے ۔

جھیل میں کنول اتنی تعداد میں بکھرے ہوئے ہیں کہ پانی کہیں کہیں ہی

طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح ٹھنڈے سایوں میں گرم دھوپ کے دھبے مجھے اس وقت دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں صبح کو اوّل وقت یہاں آیا تھا۔ کنول سے ڈھکی ہوئی اس جھیل پر ایک خوبصورت سا پُل ہے۔ پُل کے اس سمت پر جھیل کا جو حصّہ ہے اس پر بھی دور دور تک کنول ہی کنول بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن دھوبن شکارے کے لئے جو راستہ بنایا گیا ہے وہ پُل پر کھڑے ہو کر دیکھا جا سکتا ہے۔ پانی کا راستہ بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کے درمیان سے گذرتا ہوا بڑا بھلا لگتا ہے۔ دھوبن شکارا شام کو غروب آفتاب کے وقت لوگوں کو سیر کے لئے لیکر نکلتا ہے اور پھولوں کی دھرتی پر ڈولتا ہوا پانی کے راستے پر چل پڑتا ہے۔

کچھ بچے کچھ عورتیں اور مرد عقبی راستے سے اس گوشۂ تنہائی میں در آئے ہیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوا ان کی کہانی سننے کی خواہش میں بیکل ہوں۔ اس فضا کا سارا سکون آنے والوں نے درہم برہم کر دیا ہے۔ ایک بچہ کہہ رہا ہے۔ دیکھ رہی ہو کنول کیسے بکھرے ہوئے ہیں۔ دور دور تک کنول ہی کنول ہیں۔

ایک نوجوان ایک لڑکی سے مخاطب ہوا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہلکورے لیتے ہوئے پانی کا وجود ہی معدوم ہو گیا ہے۔ کسی بھی شئے کی اصلیت کا اسطرح چھپ جانا انسانی زندگی کے لئے المیہ کی طرح ہے۔ کیا ہم کنول کے ان پھولوں پر ان پتیوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ سکتے ہیں ——— ؟

میں بنچ پر سوئے ہوئے جس آدمی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اب آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا ہے۔ بچوں، مردوں اور عورتوں کی یہ ٹولی خوش گپیاں کرتی ہوئی آگے نکل گئی ہے۔ ایک بچہ میرے قریب آکر رک گیا ہے۔ وہ بڑی

حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے ۔ میرے فاؤنٹین پن کی نب سفید کاغذ پر جو نقوش چھوڑ رہی ہے وہ ایک ایسے مسافر کے نقشِ قدم ہیں جو ریت پر چل رہا ہے اور سراب کو سمندر جان کر اپنی تشنگی مٹانے بڑھ رہا ہے ۔

میں جب نظریں اٹھاتا ہوں تو وہ سہم جاتا ہے میں مسکراتا ہوں کہ آدمی کے دل سے آدمی کا خوف دور ہو سکے وہ بھی جواباً مسکراتا ہے اور اپنی بہن کو پکار کر کہتا ہے ۔

دیکھو عینا ! یہ شاعر ہے ۔ عینی یہ بات سن کر میرے اور اس کے قریب آتی ہے ۔ کاغذوں پر ایک نظر ڈالتی ہے جو میرے سامنے دھرے ہیں اور جن پر میں نے پیپر ویٹ کے طور پر سگریٹ اور کاڑی کی ڈبیاں رکھدی ہیں ۔ یہ شارٹ ہینڈ ہے جو وہ لکھ رہا ہے اور پھر دونوں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ۔ میں سوچتا ہوں اس معاشرہ میں جس میں سانس لے رہا ہوں ۔ شاعری اور شارٹ ہینڈ میں کتنا فرق ہے شاید اتنا ہی جتنا میرے دل اور انگلیوں کی پوروں میں ہے ۔ کیونکہ کسبِ معاش کے وقت مجھے ان دونوں میں کوئی ایسا خاص فرق بھی تو نظر نہیں آتا ــــــــ

بنچ پر بیٹھا وہ آدمی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے گہری نیند سو رہا تھا ۔ سب نے بھی اس پر نظر ڈالی چھدری چھدری سی بوکرڈ کی داڑھی جس چہرے پر مجھے اب نظر آئی ہے ۔ وہ چہرہ اس بیماری سے بہت جلد مسخ ہو جانے والا ہے جس کے آثار مجھے اس چہرہ پر صاف دکھائی دے رہے ہیں ۔ یہ چہرہ اس آدمی کا چہرہ ہے جو ابھی ابھی بنچ پر سو رہا تھا ۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ۔ میری طرف غور سے دیکھتا ہے ۔ لیکن میں اس کی طرف نظریں نہیں اٹھاتا ۔ وہ چاہتا ہے کہ

اس کی طرف توجہ کروں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میری ذراسی توجہ سے وہ میرے
ب آجائے گا۔ اور پھر مجھ سے پیسے مانگے گا۔ کم از کم سگریٹ تو مانگ ہی
گا۔ لیکن میری بے توجہی کے باوجود وہ میری طرف آرہا ہے۔ میں کن انکھیوں سے
دیکھ چکا ہوں اور نظریں جھکالیں ہیں۔ جیسے اس کی آمد سے بے نیاز
۔ وہ آکر میرے مقابل کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ نظریں
اکر اس کا مکروہ چہرہ دیکھوں۔ لیکن میں زیادہ دیر تک اپنے کاغذوں پر جھکا
بھی نہیں رہ سکتا ہوں۔ کیونکہ مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔ مجھے اس کے گندے وجود کے
ب کا احساس ستا رہا ہے۔ آخرش میں اس کو اسطرح دیکھتا ہوں کہ میری بیزار نگاہوں
وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔

"کیا چاہتے ہو ؟" میں رعونت سے کہتا ہوں۔

"کچھ بھی تو نہیں!" وہ لوٹ جاتا ہے۔

میری جانب پشت کئے جھیل میں جھومتے ہوئے کنول کے پھولوں کو وہ دیکھ
رہا ہے۔ میں ان پھولوں کو دیکھ رہا ہوں۔ میری نظریں اسی مقام کا طواف کر رہی ہیں۔
ان اس کی نظریں بھٹک رہی ہیں میری آنکھوں کی بینائی کو اس کی بینائی سے کوئی گھن
میں آئی ہوگی ورنہ کنول کے ان پھولوں پر جنھیں میں دیکھ رہا ہوں اس کی نگاہوں کے
بھٹے سے اُبھر آتے۔ مجھے تو صرف اس کے وجود سے گھن [illegible] ہے۔ ایک آدمی کو
ب آدمی کے وجود سے گھن آتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ [illegible] تھا ابھی میری نظریں
ں سے چار ہونے سے کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ میں بھی وہ سب
کچھ دیکھ لیا ہو گا۔ جو میں اس چھدری داڑھی والے مسخ چہرے کے آدمی میں دیکھنے

میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ پل پر کوئی سرخ د سفید بوڑھا سفید سوٹ پہنے گذر رہا ہے ۔ اپنے سفید بالوں کو اس نے مہندی چڑھا کر سرخ بنا رکھا ہے ۔ جو سفید فلیٹ کے نیچے بکھرے ہوئے ہیں اس نے بغل میں کچھ کتابیں دبا رکھی ہیں پل پر اپنی سوچوں میں گم سم خراماں خراماں چلتا ہوا یہ سفید پوش بوڑھا میری نظروں کو بھلا لگ رہا ہے میں اس بوڑھے کو میلے چکٹ کپڑوں میں سامنے خالی پڑی ہوئی بنچ پر سوتا ہوا دیکھتا ہوں اور اس چھدری داڑھی کے مسخ چہرے والے شخص کو سوٹ اور فلیٹ میں پل پر چہل قدمی کرتا ہوا ۔ میری انسان دوستی کے تصورات میلی دھجیوں اور نکھرے ستھرے سوٹ کے درمیان ابھی اُلجھے ہوئے ہیں کہ وہ آدمی پھر میری طرف بڑھتا ہے جو بنچ پر سو کر اٹھا ہے اور جس کو میں اپنے اصلی لباس میں اپنے قریب آتا ہوا دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے پھر الجھن سی ہونے لگی ہے ۔

وہ میرے برابر سے گذرتے ہوئے مجھ سے کہتا ہے ۔ بنچ میں نے تمہارے لئے چھوڑ دی ہے ۔ آرام سے وہاں بیٹھ جاؤ ۔

میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ہوں اور وہ چپ کا سا چلا جاتا ہے ۔ میں مناظر کے اس حسن میں نظاروں کی اس خوبصورتی میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہوں ۔

سطح آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتوں پر کوئی خوبصورت سا ننھا پرندہ کیڑوں کے تعاقب میں چل رہا ہے ۔

درختوں کے جھنڈ میں سڑک پر بھاگتی ہوئی ڈبل ڈیک کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ ان بسوں میں سوار ہو کر کتنے ہی لوگ اپنے اپنے روزگار کے پیچھے بھاگ رہے ہوں گے ۔

سطحِ آب پر بکھرے ہوئے کنول کے پتیوں پر خوبصورت سا ننھا پرندہ بھی تو اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے جس کے تعاقب میں سیکلوں پرڈکتا دُن موٹر طن بسوں میں لوگ بھاگ رہے ہیں۔ پھر میں زندگی سے بھاگ کر اس گوشۂ تنہائی میں کیوں چلا آیا۔ صرف اسی لئے کہ میرے بیدار ذہن کو میرے زندہ فن کو زندگی سے دور لے جاکر بہلا سکوں۔ تھپک کر آسودہ کر سکوں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھ کر اسے ملا سکوں۔ اگر کہانی کی تلاش مجھے یہاں لے آئی ہے تو میں وقت سے کٹ کر وقت کی کونسی کہانی لکھوں گا۔ زندگی سے بھاگ کر زندگی کا کونسا افسانہ تحریر کروں گا۔

چڑھتے ہوئے سورج نے مختلف زاویوں سے اپنی کرنیں مجھ پر پھینکی ہیں تو دھوپ کی حدت سے بچنے کے لئے میں نے وقتاً فوقتاً اپنا مقام بدلا ہے۔ اب میں جھیل سے بالکل قریب چلا آیا ہوں۔ میری داہنی جانب باغ کا وہ بڑا ہٹل ہے جس پر سے سواریاں دوڑتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ سرِشام یہاں بھی بڑی گھما گھمی ہوگی۔ جھیل میں بکھرے ہوئے کنول کے پھولوں کی طرح انسان سارے باغ میں بکھر جائیں گے۔ یہ گوشۂ عافیت جہاں میں بیٹھا ہوں۔ آئس فروٹ، خوانچے اور ٹھیلے والوں کی آماجگاہ ہوگا۔

میری توجہ یکایک بٹ جاتی ہے کوئی شخص جھیل میں اکڑوں بیٹھا ہوا سطحِ آب پر ڈول رہا ہے میں اٹھ کر دیکھتا ہوں ایک چھوٹی سی ٹن کی ہلکی پھلکی ناؤ کے سرے پر اکڑوں بیٹھا ہوا آدمی جھک کر اپنے ہاتھوں سے پانی کو اپنی جانب سمیٹتا ہے اور ہولے ہولے آگے بڑھتی ہے۔ یہ باغ کا مالی ہے۔ مرجھائے

ہوئے کنول کے پھولوں کو اور سڑے ہوئے کنول کی پتیوں کو وہ یا تو نکال لیتا ہے یا انھیں پھر سے تازگی حاصل کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اس کی ناؤ آگے بڑھ رہی ہے اور پانی کی پگڈنڈی سی پیچھے چھوٹ رہی ہے۔

سامنے والے چھوٹے پل پر جو جھیل کے بیچوں بیچ ہے کوئی ٹولی پلاسٹک کے رنگ برنگے باسکٹوں سے آم نکال کر کھا رہی ہے۔ اطراف میں اِدھر اُدھر لوگ سائے دار درختوں کے نیچے ستا رہے ہیں۔ بائیں جانب ٹین کی بڑی سی چھتری — — — کے نیچے جس کی جالیاں ہری ہیں اور حاشیہ سفید، دو لڑکے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ دراصل ان میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ سے وہ آم جھپٹ لینے کی کوشش میں ہے۔ جو ایک باسکٹ سے دوسرا لے بھاگا۔ وہ شخص جو بنچ پر سو کر اٹھا تھا اور جس کے قرب سے مجھے گھن آ رہی تھی ان بچوں کے قریب ہی کھڑا ہے اور انھیں جھگڑتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ پل پر مگن ٹولی سے ایک لڑکی نکل کر ان گتھم گتھا لڑکوں کے قریب بھاگ رہی ہے۔ بچے نے آم ہوا میں اُچھال دیا تاکہ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے بچ کر لڑکی کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ لیکن درمیان میں سے اس مسخ چہرے والے آدمی نے آم اُچک لیا اور ایک لمحہ ٹھہرے بغیر دوسری سمت بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ بچوں نے شور مچایا۔ پل پر مگن ٹولی متوجہ ہوئی ہے لیکن وہ بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔ مجھے اس کی تھیلی کا خیال آ رہا ہے جس کا رنگ انسانی پسینے کی کھار کا رنگ ہے اور جس میں جھانک کر میں اشرفیاں دیکھنا چاہتا تھا۔

میں جس کہانی کی تلاش میں پھولوں کی اس نگری میں آ پہنچا تھا۔ یہ نگری بھی میرے اس شہر سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ جہاں میونسپلٹی کے ڈبّوں

سے انسانوں کا غول اپنے لئے غذا مہیا کرتا ہے۔

اپنی دری کو میں ابھی ابھی گھسیٹ کر ایک گھنے پیڑ کے نیچے لے آیا ہوں۔ میری تھرموس اس دری پر لڑھک گئی ہے اور ٹھنڈا میٹھا پانی بہہ نکلا ہے۔ چونکہ تھرموس بھی کارگ نہیں ہے۔ پھر بھی ڈھکن کی وجہ سے میرے لئے بہت سا پانی بچ رہا ہے۔ پانی گرنے سے بے شمار چیونٹیاں جو دری سے چمٹی ہوئیں ایک سوکھی میٹھی روٹی کے ٹکڑے کو مرکز توجہ بنائے تھیں منتشر ہو گئی ہیں اور اس انتشار کے سبب میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کب سے میری اس دری کے ساتھ ساتھ باغ میں نقل مقام کرتی رہی ہیں۔ چیونٹی کی ننھی سی جان کے لئے یہ مسافت جو اس قافلے نے میری دری پر طے کی ہے۔ میلوں کی مسافت ہو سکتی ہے ــــــــ چیونٹی کی ہمت اور استقلال کا سبق میں نے بچپن جماعت میں پڑھا تھا۔ تیمور لنگ نے چیونٹی سے سبق حاصل کیا تھا۔ لیکن میں نے اس قافلے کو اپنی دری سے الگ کر دینا ضروری سمجھا ہے میرے لئے چیونٹیاں شاید کسی نصیحت کا باعث نہ بن سکیں۔ اس لئے کہ میرے سامنے کوئی ایسی دیوار ہی نہیں ہے جس پر چڑھنے کی کوشش میں یہ چیونٹیاں بار بار گریں اور بالآخر کامیاب ہو جائیں۔ میری نظروں کے آگے جو دیواریں کھڑی ہیں وہ تو کچھ ایسی ہیں جن پر یہ ننھی ننھی چیونٹیاں تو کیا دیو ہیکل آدمی بھی نہیں چڑھ سکتا حالانکہ اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کر لیا ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ کے فتح ہو جانے اور چاند کے زمین بن کر آدمی کے پاؤں تلے آجانے سے نہ اس مسئے چہرے کا کوئی تعلق ہے۔ جس نے

بچوں سے آم جھپٹ لیا ہے نہ اس غول سے کچھ واسطہ ہے جو میونسپلٹی کے ڈبوں سے اپنے لئے غذا مہیا کرتا ہے، نہ اس کہانی سے کوئی ربط جس کی تلاش میں میں سرگرداں ہوں۔ ایسا لگتا ہے ۔ جیسے انسانی برادری میں پھوٹ پڑ گئی ہے ۔ جدھر سینگ سمائے قافلے نکل پڑے ہیں۔ کوئی زمین کا سینہ چیر کر آپ ہی اپنی قبر میں اُتر رہا ہے کوئی چاند پر کمند پھینک کر ہانپ رہا ہے ۔

میں نے پاس ہی پڑا ہوا ایک ڈنٹھل اٹھا لیا ہے اور دری سے چمٹے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو الگ کر دیا ہے لمحہ بھر کے بعد یہ منتشر چیونٹیاں پھر متحد ہو کر روٹی کے ٹکڑے پر ٹوٹ پڑی ہیں ان کے اس اتحاد سے بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں کوئی سبق حاصل کروں اس لئے کہ میں انسان ہوں ـــــ میں عظیم ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے لفظوں کے خطوط میں چمن کے اس کنج کی ایک تصویر مکمل کر لی ہے جہاں میں کہانی کی تلاش میں اپنی روزمرہ کی زندگی سے بھاگ کر چلا آیا تھا اس تصویر میں زندگی کے کچھ اور رنگ بھرنے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ پوسٹ آفس پہنچتا ہوں اور ایک ایڈیٹر کے نام اس کہانی کو پوسٹ کر دیتا ہوں ۔ انھیں لکھتا ہوں ۔

" معاوضہ فوری بھجوا دیجئے۔ مجھے شدید ضرورت ہے " ـــــ پھر جملہ بُرا کھلتا ہے ۔ میں اسے کاٹ دیتا ہوں۔ پھر کچھ سوچ کر کٹے ہوئے جملے پر چھ سات بار صاد کر دیتا ہوں ـــــ لیکن کاٹنے اور بنانے کے اس عمل نے جو دھبے کاغذ پر ابھارے ہیں کیا یہی اس کہانی کا اصلی روپ نہیں ہیں؟ کیا یہ کہانی مکمل نہیں ہے ؟

# گٹھری

**اُف** وہ آنکھیں کیسی آنکھیں تھیں۔ کھلی ہوئی ہونے کے باوجود وہ کسی کو دیکھ نہیں رہی تھیں اور پھر انھیں دیکھنا بھی تو کسی کے بس میں نہ تھا۔

اچھی بھلی "نانم" اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ رات کے ایک بجے تک گپیں ہانکتی رہیں تھیں۔ سب سو گئے تو منو کو سلانے کیلئے انھوں نے مینا کی وہ کہانی بھی سنائی جس کا گھر موم کا تھا جو بارش میں نمک کے گھر کی طرح نہ ڈھے سکتا تھا نہ بہہ سکتا تھا۔ اور صبح ہوئی تو نانم، بستر پر نمک کے گھر کی طرح ڈھے گئی تھیں۔"

حلق سے خرخر کی آوازیں نکلتی سن کر چہیتی نواسی جونا نے بھرپور انگڑائی لی۔ نیند کے ٹوٹنے کا غم ہی کیا تھا کہ اسے خیال آیا۔

نانی اماں کو فجر کی نماز کیلئے بھی تو اٹھانا ہے۔ اس نے جھنجھوڑا لیکن وہ تو خرخرانے میں بے سدھ تھیں۔

"ہائے میری توبہ!" اُس نے اوڑھنی کا خیال کئے بغیر ایک ہی چھلانگ میں تخت نیچے سونے والوں کو عبور کر لیا اور دھم سے سیدھی وہاں پہنچی جہاں مامی سو رہی تھیں۔

"مامی اُٹھیئے۔ خدارا اُٹھیئے نا" نانم کیسا کر رہی ہیں"

ہڑبڑا کر مامی اٹھیں تو نانم نے خرخرانا بند کر دیا تھا۔

"رات کی جاگی ہیں نا جونا۔ سو رہی ہیں اچھی بھلی ـــــ تو بھی سو جا۔ جا بیٹا۔"

نہیں مامی ہنہیں۔ ابھی ابھی وہ آوازیں نکال رہی تھیں ـــ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

بہتا بہتا لہنگا اور ساری درست کر کے مامی اُٹھیں۔

یہ بڑے سے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ساری اور لہنگے کو گھما پھر ا دو قدم چلنے کے قابل ہوئیں۔ پیٹ میں چھپا ہوا بچہ جاگ پڑنے کے خلاف تھا۔ سو رہو سو رہو۔ نیند میں مزہ ہے جاگنے میں پریشانی۔ لیکن جونا مُصر تھی "مامی یقیناً نانم کچھ ہو لے ہے"۔

مامی نے نانم کو اتنا جھنجھوڑا کہ خود ہانپ گئی۔ دوبار زیر ناف دونوں ہاتھ دیکر پیٹ کو اسطرح سنبھالا جیسے فٹ سے بچہ باہر نکل آئے گا۔

"جا جونا بلا لا اپنے ماما کو" مامی نے ہار مان کر نانم کے لئے خطرے اعلان کر ہی دیا۔

جونا بھاگی۔ بھاگتے وقت اسے خیال آیا۔

ماما ہوں تو آئیں بھی۔ وہ تو مسجد کے کسی گوشے میں مراقبے میں ہوں گے، وہ پچھلے پاؤں لوٹ آئی۔

مامی! ماما تو مسجد میں ہوں گے"

"آئی، تو کیا کوئی مسجد میں قدم نہیں دھر سکتا، کسی کو بھجوا دے، کہلوا نا کہ بہت عبادت ہو چکی اب ایک دو قطرے پانی اپنی ماں کے حلق میں بھی ڈال جائیں"

ماسی کے لہجے کا یہ انداز جوتا کے لئے نیا نہیں تھا۔ اور پھر ایسی صورت میں جبکہ دو دن پہلے ہی ماسی اور ماما میں گھمسان کا رن پڑا تھا، تو کیا ماسی اپنی باتوں میں پھولوں کی خوشبو بسا کر بھیجتیں۔

ماما آئے۔ ڈاکٹر کیلئے بھاگم بھاگ لوٹے۔ نانم پر ایک بے سدھی چھائی ہوئی تھی سو تھی۔

ڈاکٹر نے اعلان کر دیا کہ فوراً دواخانے میں رجوع کر دیا جائے گھر پر علاج ممکن نہیں۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد ایمبولنس دستیاب ہوئی اور نانم کو اسٹریچر پر ڈال کر ہاسپٹل پہنچایا گیا۔ تار پر تار دیئے گئے۔ نزدیک و دور بیٹے بیٹیوں کو اطلاع دی گئی کہ نانم کی حالت تشویشناک ہے۔ کوئی آج پہنچا کوئی کل پہنچا اور اس طرح آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

آنے والی بیٹیوں کے دل راستہ بھر ٹرینوں کی رفتار کے ساتھ دھڑکتے رہے کہ خدا جانے کیا منظر دکھائے۔ بیٹیوں اور نواسیوں کی آنکھیں جھر جھر بہتی رہیں۔ اماں کو بخش دے میرے مالک۔ نانم کو بخش دے میرے معبود اور پھر نانم کے بستر کے اطراف چاہنے والوں کا میلہ سا لگ گیا۔

واقعی نانم ہوش میں رہتیں اور آج اتنے سارے جگر گوشوں کو اپنے گرد

جمع دیکھیں تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کا مرض بغیر کسی علاج ہی کے دفع ہو جاتا لیکن نانم بے چاری تو ہر آنے والے سے بے نیاز تھیں۔

ڈاکٹروں نے سر جوڑ کر مرض کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ہیمرج ہے، سیریبرل تھرمبوسس ہے، کوما ہے، فالج ہے، بہرحال اس خاندان کا کوئی ایسا مرض ہے جو ہوش و حواس پر شل بن کر گرتا ہے۔

آنسوؤں اور دھڑکتے دلوں کے بیچ میں نانم چونکہ سب کو پیاری تھیں اسلئے ابھی تک اللہ کو پیاری ہونے سے بچی ہوئی تھیں۔ کوئی دقیقہ آل اولاد نے اٹھا نہ رکھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے دیکھا، ملاؤں پنڈتوں نے دیکھا۔ لیکن ہوش تھا کہ نہیں آتا تھا۔ ایک نہیں دو نہیں تین روز گذر گئے تھے۔

آخر شش ڈاکٹروں نے بہ اتفاق آراء اظہار کیا کہ مزید تین چار دن یہی بیہوشی طاری رہ سکتی ہے اور اس دوران میں قوت جواب نہ دے اور عام حالت اچھی رہے تو ہوش آجائے گا۔

نانم کو جیسے ڈاکٹروں کا یہ جھوٹ کھل گیا۔ رات ہی سے طبعیت اور بگڑی نبض کی رفتار اور دھیمی ہو گئی۔ دل دھڑکتے دھڑکتے بیچ میں جل دے کر ٹھہر جانے کی کوشش کرتا۔ ناک میں نلکی داخل کر کے غذا تو پہلے ہی سے سرنج سے دی جا رہی تھی۔ اب ہاتھ اور پیر کی رگوں میں ربر کی ٹیوب سے ملی ہوئی سوئیاں داخل کر دی گئیں ہر ٹیوب کا دوسرا سرا بیا کے گھونسلوں کی طرح الٹے لٹکے ہوئے گلوکوز کے شیشوں سے ملا ہوا تھا۔ اس پر بھی زندگی نانم سے بھاگ رہی تھی۔ سانس لینے میں انھیں بے حد تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نہ زبان سے کچھ کہہ سکتی تھیں نہ اشارے

کنائے ان کے بس میں تھے ۔ ڈاکٹر اور متعلقین ان کی گرتی ہوئی حالت ہی سے سب کچھ جان جاتے تھے ۔ دوسری نتھنی میں بھی ربڑ کی نلکی داخل کر کے آکسیجن چڑھائی جانے لگی۔ پیٹھ اور پسلیوں سے پانی اور رطوبت نکال کر امتحان کیا گیا۔ بہر حال ملک میں سائنس نے جتنی ترقی کی تھی اسے نائم نے کھلا چیلنج دے رکھا تھا۔ اور کس کی جیت ہوتی ہے یہ دیکھنے کیلئے انھوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔ ان آنکھوں کو کسی فرد سے کوئی تعلق جیسے نہ تھا۔ کسی ایک ہستی سے کوئی واسطہ جیسے نہ تھا۔ یہ آنکھیں تو ساری انسانی عقل کا تماشہ دیکھ رہی تھیں ۔ اور لوگ کہہ رہے تھے پاکستان کو تار دے دو۔ کینیا کو کیبل بھجوا دو ۔ منجھلے اور بڑے کی ہی تو یہ کھلی کھلی آنکھیں منتظر ہیں ۔ وہ آجائیں تو ان آنکھوں میں چمک آجائے گی ۔

لیکن اس تماشے میں نائم ہارنے لگیں ۔ ڈاکٹروں نے رات بھر کوشش سے یہ ثابت کر دکھایا کہ سائنس کی ترقی کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا ۔

پلک جھپکائے بغیر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے رکھنے والے متعلقین نے ایک دوسرے کو خوشی کے آنسوؤں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی مدھم نظروں سے دیکھا ۔

خدا نے اماں کو بخش دیا ۔ اللہ میاں نے نائم کو ہمیں واپس لوٹا دیا ۔

پھر آہستہ آہستہ نائم کی نبض کی رفتار ٹھیک ہونے لگی ۔ دل کی دھڑکن کی بے ترتیبی ختم ہونے لگی ۔ سانس کی آمد و شد میں وہ اذیت نہ رہی اسطرح مزید چار دن اور گذر گئے ۔ آکسیجن کی نلکی نکال دی گئی ۔ ہاتھ اور پیر کی رگوں میں دھنسی ہوئی سوئیاں بھی یکے بعد دیگرے نہ رہیں ۔ نائم اب اطمینان سے سانس لے سکتی تھیں ۔ ان کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں بے ساکت سی بے نور سی ۔ نہ کسی کو پہچاننا اور نہ

اپنی ہی حالت کے پہچاننے میں کسی کی مدد کرنا۔ جدھر منہ پھیر دیا جاتا اُدھر کو یہ آنکھیں دیکھتی رہتیں۔ اور ان آنکھوں کی یہ بے تعلقی تو دیکھی نہ جاتی تھی۔

دس دن ہو گئے لیکن نانم کو ہوش نہ آیا۔ کولھوں اور بازؤوں پر انجکشن لگتے رہے۔ ناک کی نلکی ہر دوسرے تیسرے روز کھولتے ہوئے پانی میں نہانے کے لئے باہر نکلتی رہی۔ پھر اس نے کبھی جوس اور بشیر کے شوپ کا مزہ چکھا۔ کبھی میووں کا رس نچوڑ لیا۔ کبھی حریرہ ہڑپ کر گئی اور نانم ہر ضیافت سے بے خبر سانس لیتی رہیں۔

نانم کی آل اولاد کا رشتہ اب صرف ان کی چلتی ہوئی سانس سے ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسا آیا تج کر جن دو ایک چاہنے والوں نے نانم کو موت کے منہ سے جھپٹ لیا تھا۔ انھوں نے جب اپنی سُدھ بدھ لی تو زندگی نے انھیں چھپ چھپ کے اشارے کئے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔ تیمار دار و تم خود ہی بیمار نظر آ رہے ہو۔ تم پڑ جاؤ گے تو پھر نانم کا کون کرے گا۔

جنھیں نانم کے ساتھ ساتھ خود سے محبت تھی انھوں نے کچھ پہلے ہی جان لیا تھا کہ نانم نہ کھل کر رو لینے دیتی ہیں نہ سکون کا سانس لے کر سونے دیتی ہیں خود لٹک رہی ہیں اور انھیں بھی معلق کر کے چھوڑ دیا ہے۔ سو ان لوگوں نے کچھ پہلے ہی نانم کی بے نور آنکھوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ان کی سانسوں ہی کو ان کی چلتی پھرتی زندگی مان لیا تھا اور خود معلق لٹکنے کی بجائے زمین پر اپنے قدم دھر دیئے تھے۔

"کیا کروں اس لونڈیا کو بس دن رات بسورتی رہتی ہے۔ مدنہ میں بھی دوا خانے میں اماں کے قدموں سے لگی پڑی رہتی۔ آپ کتنی خوش نصیب ہیں آپا کہ دن رات ان کی خدمت کر رہی ہیں مجھ نصیبوں جلی کی ایسی قسمت کہاں۔ اچھا

اب چلوں - شام جلد آجاؤں گی"

دس دن سے پندرہ دن ہوئے اور نانی کو ہوش نہیں آیا - لیکن نانی کی بے ہوشی کے ٹوٹنے کی امید میں جو لوگ گھر بار بھولے ہوئے تھے وہ اب آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے - آپم بے چاری قابل رحم تھیں - مشت استخواں - بارہ بچوں کی ماں - جنتے جنتے بے حال ہو گئی تھیں، تو دوسرے ان کے میاں کا یہ حال تھا کہ پہچانے نہ جاتے تھے - نانی کی بے ہوشی کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تو بچوں اور گھر بار کی یاد نے آہستہ آہستہ آپم کو آگھیرا - بس تار پڑھا تھا اور اٹارسی سے چل پڑی تھیں بے حد بھولی اور معصوم تھیں - بارہ بچے جن دیئے تھے اور اب سب کے سب انھیں عقل سکھاتے تھے - تار پڑھ کے سنایا گیا تو کہنے لگیں - " ذرا اِدھر بتانا تو ــــ" بچوں نے جانتے ہوئے بھی کہ انھیں انگریزی نہیں آتی تار سامنے کر دیا -

آپم نے بغور دیکھا کہنے لگیں " واقعی اماں کی طبیعت بہت خراب ہو گی تار انھوں نے اپنے خط سے بھی نہیں لکھا - لکھنے پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوں گی جو اوروں سے لکھوایا ہے" -

بچوں نے ہنسی روک لی - دو چار شریر تھے جو بے ساختہ ہنس پڑے آپم نے ایسی نظروں سے انھیں دیکھا جو آنسوؤں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور بچوں نے پشیمان ہو کر خود کو بھی غمگین بنا لیا -

آپم چلیں تو رکشہ میں آنسو نہ تھمے - اسٹیشن پہنچ کر اپنی حالت کو سنبھالا ٹرین میں بیٹھ گئیں اور سب رخصت ہو گئے اور ٹرین رینگنے لگی تو آپم نے پلّو پھر آنکھوں پر رکھ لیا - لیکن کب تک ؟ اٹارسی سے حیدرآباد کا فاصلہ اتنا طویل

ہے کہ آنسو سوکھ گئے پر جی تھا کہ امڈ امڈ کر آتا تھا۔

آپم نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ پہنچتے کے پہنچتے انھیں اپنے چھوٹوں سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رو لینا ہے۔ بزرگوں کی تسلیاں سننی ہیں اور صبر کی تلقین پر سعادت مندی سے سر ہلا لینا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر پھر ان کا دل بھر آتا۔

لیکن جب وہ اندر پہنچی تو سب سہمے تھے۔ نہ کھل کر رو لینے کا موقع تھا، نہ رو دھو کر چین سے کسی گوشے میں بیٹھ رہنے کا۔ لوگ گونگے بہرے سایوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ رات آنکھوں آنکھوں میں کٹتی تھی۔ آپم نے یہ نقشہ دیکھا تو خود بھی سہم گئیں۔ لمبے سفر کی تھکان جو آپم کے ساتھ تھی اسے دور کرنے کے لئے فرش پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئیں اور حسرت سے اماں کو تکتی رہیں پھر سوکھے پانوں کا بیڑا بنا کر جبڑے میں دبا لیا۔ پھر چٹکی بھر زردہ پھانک کر پیک کو اسطرح منہ میں گھلایا جیسے رس گلا کھا رہی ہوں۔ پھر لمبی ٹھنڈی سانس لی اور بیٹھ رہیں۔

منجھلی بہن ماں کی تیمارداری میں جٹی ہوئی تھیں۔ دن رات اس نے ایک کر دیا تھا۔ گھر بار اور بچوں کی سدھ نہ تھی۔ ہاسپٹل سے دو میل پر گھر تھا لیکن انہوں نے دو ہفتوں سے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نانی کا سارا کام اپنے ہی ہاتھوں کرتیں۔ ناک کی نلکی سے سرنج بھر کر غذا پہنچاتا۔ بدبو سے بچانے کے لئے وقتاً فوقتاً نانی کے بدن کی صفائی کرنا۔ دوائیاں پلانا غرضیکہ اچھی خاصی تربیت یافتہ نرس بن گئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے بھی ان کی نرسنگ کو سراہا

تو منجھلی کی اہمیت خاندان کے آنے جانے والے افراد میں مسلّم ہو گئی۔ ملنسار تھیں، بحد خلیق، لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں سے ایسا بہناپا پیدا کر لیا کہ ہاسپٹل بھر میں ڈاکٹر سمجھی جانے لگیں۔ لوگوں کی غلط فہمی پر یہ خوش فہمی کا شکار ہو گئیں۔ اپنے تئیں خود کو ڈاکٹر ہی سمجھ بیٹھیں اور اس انا نے اتنا غلو کیا کہ وہ سوائے اپنے کسی بہن یا بہو کو نانم کی تیمار داری کا اہل ہی نہیں سمجھتی تھیں۔

بہنوں، بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں میں جو زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے تھے انھوں نے منجھلی کی مزاج داری ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اور جان بوجھ کر منجھلی کو بلندیوں میں اچھالا تاکہ خود کو آہستہ سے کھسکنے کا موقع ملے۔

جو ذرا کم فہم اور زود رنج تھیں انھوں نے منجھلی کے اس طرح خود کو اہمیت دے لینے پر پہلے پہلے بُرا مانا۔ لیکن جب حواس درست ہوئے اور نانم کی طویل بے ہوشی کے امکانات کا علم ہوا تو قسمیں کھا کھا کر منجھلی کو بتایا کہ "منجو باجی ذرا آپ ہی سوچیے آپ کے کیے سے انکار کرنے والا کافر۔ یہ سب ایسوں کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں جو ایسے وقت بھی ہماری محبتیں اور رفاقتیں نہیں دیکھ سکتے۔ اور کیا آپ اپنا تن من لگا نہ دیتیں تو اماں بی ہمیں واپس مل سکتیں؟ پہلے اللہ اور اس کا رسول ہے اس کے بعد آپ اور بھائی میاں ہی تو ہیں جنھیں اپنی سُدھ بدھ بھی نہیں ہے کیا ہماری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ کیا ہمارے ایمان مر گئے ہیں۔"

اور منجھلی آیا آنسو پونچھ کر مورچے پر ڈٹ گئیں۔

اور نانم کے ماما محلہ کی مسجد سے اپنے معتقدین کے ساتھ ہاسپٹل ہی کے ایک گوشے میں اٹھ آئے۔

بیس دن ہونے کو آ گئے لیکن نانم تھیں کہ آتی جاتی سانسوں کی ڈور تھامے، اپنے کھلے دیدوں سے زندگی کا اعلان برابر کر رہی تھیں۔

ڈاکٹروں نے اب آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

ایسے مریض دو مہینے بھی اسی حال میں رہ سکتے ہیں دو سال بھی اور اس سے زیادہ بھی اور ابھی تو صرف بیس دن ہوئے تھے۔

نانم ایمبولنس میں جب پہلے پہل دواخانہ میں لائی گئی تھیں تو دوسرے دن ہی خبر پاکر خاندان کا خاندان ٹوٹ پڑا تھا۔ ملنے کے اوقات کی ابھی گھنٹی بھی نہیں بجتی تھی کہ لوگ جوق در جوق آنا شروع ہوتے۔ سارا کمرہ بھر جاتا۔ یہاں تک کہ وارڈ میں بھی نانم ہی کے لوگ نظر آتے۔ دوسری گھنٹی ملنے کے اوقات کے اختتام کا اعلان کرتی تب بھی بجائے اس کے کہ آئے ہوئے لوگ واپس جاتے۔ نئے لوگ آتے رہتے لیکن ان بیس دنوں میں کایا پلٹ گئی تھی۔

دو روز، چار روز، چھ روز، دس روز آنے والے اپنے اخلاص کے پیمانے اپنے اپنے دِلوں میں چھپائے آتے رہے۔ لیکن بیس دن تک اخلاص کا مظاہرہ کرنے کے لئے کوئی پیمانہ ہی نہ بنا تھا تو بیچارے لوگ کیا کرتے۔ اب پہلی گھنٹی بجے کہ دوسری گھنٹی نانم کے کمرے کی خاموش فضا میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ بس دو چار چہرے اپنی اپنی مجبوریوں کو محبت کا نام دے کر ہاسپٹل کا طواف کیا کرتے۔ ان طواف کرنے والوں میں ایک تو منجھلی آپا کے بڑے پائے سے شوہر تھے۔ دنیا کی ہر بات میں پہلے انسانیت کی بو تلاش کرتے تھے۔ پھر سب کچھ لیکن اس انسانیت کی بو کے تعاقب میں اتنی دور نکل جاتے کہ ہانپنے لگتے اور آخر ش گھنے جنگل میں ایسے

شکاری کی طرح اکیلے رہ جاتے جسے نہ شکار ملا نہ لوٹنے کا راستہ۔

ان بے چاروں کی مجبوری یہ تھی کہ منجھلی آپا ان کی کمزوری تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ جان گئے تھے کہ منجھلی آپا نے انھیں کبھی محبت نہ دی لیکن پیار تو پاگل پن کا دوسرا نام ہے کہیں سے کچھ ملے نہ ملے۔ قیس کے مقدر میں نہ لیلیٰ تھی نہ ناقہ لیلیٰ۔ صرف دشت کی وسعتیں تھیں سو اس نے وفاؤں کا بول بالا کر دیا۔ یہاں تو اچھی بھلی منجھلی آپا ان کی معشوقہ تھیں وہ بھی کیسی جو بیوی ہو۔ جب چاہا ہاتھ لگا لیا۔ جب چاہا چھو کر دیکھ لیا۔ کیا یہ نعمتیں کم ہیں۔ اب یہ کیا ضروری تھا کہ منجھلی آپا انھیں چاہیں بھی۔ سو یہ بے چارے منجھلی آپا کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے۔ یک طرفہ محبت کی لاش اپنے سینے میں چھپائے۔

منجھلی آپا بھی نہ تلٹے کی عورت ہیں۔ جو آنکھیں بچھائے اس کے دیدے پیروں تلے مسل دیتی ہیں۔ جو نظر بھی نہ اٹھائے اس کے آگے بچھ جاتی ہیں۔ ان کے باؤلے شوہر نہ یہ باتیں جانتے تھے نہ جاننا چاہتے تھے تو صرف اتنا جانتے تھے کہ انسانیت کے ناطے اپنا دل اتنا وسیع کر لو کہ ان جیسے سارے پاگل اس میں سما جائیں۔

اب ان بے چاروں کا امتحان تھا۔ محبت کے ہر امتحان میں بدھو کی طرح سر جھکا کر وہ کامیاب اتر گئے لیکن اس امتحان کی کوئی مدت ہی نہ تھی بس آزمائشیں تھیں اور ان سے گزرنا تھا۔

نانم کی دوسری بیٹیاں اور بہوئیں اپنے اپنے شوہروں سے گھس پھس باتیں کرتیں۔ جیسے جیسے نانم کی بے ہوشی کا سلسلہ لمبا ہوتا جاتا بیویوں اور میاؤں کے سر قریب ہوتے جاتے۔ صرف منجھلی آپا تھیں کہ دوا خانہ میں اصلی لیڈی ڈاکٹر کی طرح نانم کی خدمت میں جتی ہوئی تھیں اور ان کے شوہر میل نرس کی طرح آگے

پیچھے پھرتے تھے جن سے منجھلی آپا گھڑک گھڑک کر لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے بات کرتیں لیکن وہ تھے کہ برابر دواخانے کا طواف کرتے کیونکہ میل نرس ہونے کے ناطے یہ ان کا فرض تھا۔

ڈر ہے کہ آپ ان بے چاروں کو سچ مچ کا میل نرس نہ سمجھ بیٹھیں وہ تو منجھلی آپا کی نقلی ڈاکٹری کے ناطے مارے پکڑے اس عہدہ پر فائز کئے گئے تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ منجھلی آپا کی صحت کا خیال رکھیں۔ اب تو منجھلی آپا جنرل کمزوری کا شکار بھی تھیں اور اپنی ماں کی وجہ سے فکر مند بھی۔ اس پر مستزاد دن رات کی خدمت اور تیمارداری ان باتوں سے ان کے شوہر بوکھلا گئے تھے۔ صرف ان کے ہونٹوں کی لپ اسٹک، آنکھ کا کاجل اور بالوں کا خضاب ہی اس بات کا ضامن تھا کہ انھیں اپنی بھی کچھ خبر ہے۔

منے تم نے دودھ پیا؟ تم نے خود کو انجکشن لگوایا؟ تم نے ذرا کی ذرا کمر تو سیدھی کی ہوتی۔ تم پچھلی رات سو بھی سکی ہو۔ تم لوگ باری باری سے اپنی ڈیوٹی کیوں نہیں کر لیتے۔ تم اکیلی کہاں تک نپٹو گی ذرا اپنا بھی تو خیال کرو۔ لیکن منجھلی آپا لپ اسٹک درست کرتی ہوئی ایک ہی گھڑکی میں انھیں سمجھا دیتیں کہ خاندان کی کوئی عورت میرے سوا اس کی اہل ہی نہیں ہے کہ اماں کی تیمارداری کر سکے۔ ناک کی نلکی سے غذا پہنچانا۔ بد سول سے بچانے کیلئے بدن کی صفائی کرنا۔ یہ سب ایسے ہنر ہیں کہ بڑی بڑی نرسیں نہیں کر سکتیں پھر یہ لوگ جو ڈاکٹروں سے ڈھنگ کی بات بات بھی نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ کیسے کر لیں گے۔ اور بے چارے منجھلی آپا کے شوہر بے بسی کا مجسمہ بن کر میل نرس بن جاتے۔

جیسے جیسے دن گذرتے گئے لوگ کنارہ کش ہوتے گئے۔

اب تو بات دلوں کے بس سے نکل کر ذہنوں کے اختیار سے بھی آگے جارہی تھی۔ جونا جو ایک ایک کا منہ تکتی رہتی تھی اب دیا خلے رہی میں رہنے لگی تھی اور منجھلی آپا نے آہستہ آہستہ اسے ٹریننگ دینی شروع کردی تھی۔ منجھلی آپا اصلی ڈاکٹر تھیں تو وہ بھی کسی مکمل نرس سے کم نہ تھی اور پھر منجھلی آپا کا گھر بار بھی تھا۔ بچے بھی تھے۔ میاں میل نرس کی طرح آگے پیچھے کیوں نہ پھریں گھر تو کبھی یاد آئے گا ہی۔ کیا ڈاکٹروں کے گھر بار بچے نہیں ہوتے۔ اور پھر وقت کے اتنے لمبے فاصلے بھی نانم کی وحشی آنکھوں کو آئینہ نہ دکھا سکیں گے اس کا علم کس کو تھا۔ سو اب منجھلی آپا بھی خدا خدا کر کے اپنے گھر بار میں دلچسپی لینے لگیں۔

جونا یوں بھی نانم کی جان تھی۔ ماں باپ کہیں رہیں مرادآباد میں ہوں کہ اٹارسی میں وہ تو نانم کے ساتھ بستی بستی پھرتی۔ نگر نگر کا چکر کاٹتی۔ نانم نے اس کو بے حد چاہا اتنا کہ نانم کا تصور اس سے ہٹ کر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جونا پر نظر پڑتی تو بچے پکار اٹھتے "نانم نانم آگئیں، نانم آگئیں"۔ اور اپٹر پپٹر سلیپر گھسیٹے نانم نظر آتیں تو جونا کی سہیلیاں پکارتیں "جونا دیدی، جونا دیدی"۔

کہتے ہیں نا کہ اصل سے بیاج پیارا، سو جونا نانم کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیاری تھی۔ سچ پوچھئے تو نانم کو جونا ہی مرنے نہیں دیتی تھیں۔ نانم زندہ تھیں تو صرف اس لئے کہ جونا کو دلہن بنا کر دیکھ لیں۔ سہرہ کے پھول کھلتے دیر نہیں لگتی لیکن سہرہ گندھ جائے تب نا۔ یہاں یہ عالم تھا کہ نانم اور جونا ہندوستان میں اور سہرہ گوندھنے والے ہاتھ کٹ کر پاکستان اور کینیا کدھر کدھر بکھر گئے تھے۔

اب یہ ہاتھ رول بٹور کر دولت لاتے تب ہی جونا کا سہرہ گندھ پاتا۔ سو نانم بس اسی انتظار میں گھر کی دہلیز بن کر رہ گئی تھیں اور اب وہ آنکھیں جو پاکستان کینیا سے آنے والے جونا کے سہرے کا دہلیز پر انتظار کرتی رہی تھیں۔ چپکے سے دواخانہ اٹھ آئی تھیں۔ اور یہاں آکر ان آنکھوں نے پلک جھپکانا تک بھلا دیا تھا۔

جونا تھی کہ سو بار دوپٹہ گرا کر سنبھال لیتی۔ پیر زمین پر پڑتے ہی نہ تھے۔ چلتی تو یوں لگتا جیسے چلنا سیکھ رہی ہو۔ کھیلنے کودنے کے دن جماہیاں اور انگڑائیاں لیتے کی شامیں اور ٹوٹ ٹوٹ کر سونے کی راتیں۔ جونا اپنی عمر کا یہ اثاثہ نانم کی وحشی آنکھوں کے ساتھ دواخانہ اٹھا لائی۔ نانم جب دیکھ سکتی تھیں تب بھی مٹ مٹ جونا کو دیکھے جاتیں۔ اس کی پتھریلی جوانی اب ان کے سینے پر پہاڑ بن گئی تھی۔ اور پھر اس پہاڑ کو چھاتی پر سے سرکانے والے ہاتھ تھے پاکستان اور کینیا میں جو نہ آتے تھے اور نہ یہ بوجھ اترتا تھا۔ اب اس بوجھ کے نیچے نانم ایسا دبیں کہ گنگ ہو گئیں اور آنکھیں پتھرا گئیں ان کی ــــــ جونا کو آنکھوں میں بسایا تو نانم نے ایسا بسایا کہ آنکھیں کھلی رکھ کر بھی اس کے سوا کسی کو نہ دیکھنے کی اکھوں نے قسم کھا لی۔ اب تو دواخانے میں نانم کے پاس اکیلی جونا رہ گئی تھی۔ نانم اسے اسطرح گھورتی رہتیں کہ وہ ڈاکٹروں کی موجودگی میں سو سو بار ڈھلکنے والے آنچل کو ہزار ہزار بار سنبھال لیتی۔ نانم کی آنکھیں اپنی جگہ ان کے چہرے پر بدستور موجود تھیں لیکن ان آنکھوں کی بصارت جونا کے بدن کے ہر مسام میں گھس کر چھپ گئی تھی۔ جونا کیا چلتی تھی۔ نانم کی آنکھیں چلتی تھیں۔ ان کی بصارت چلتی تھی۔ اور جونا کو کبھی کبھی نانم کی ان آنکھوں سے وحشت ہوتی۔

اور جب سے وہ آنے لگا تھا جونا کو نانم کی آنکھیں زیادہ ہی وحشت زدہ

لگی تھیں - جیسے نانم جان گئی ہوں کہ جوتا نے پھر دل ہار دیا ہے - یہی فکر تو بس نانم کو کھائے جاتی تھی کہ دل ہارنے والی ان کی ننھی منی جوتا کہیں کسی کے آگے اپنا آپا ہی ہار دے تو یہی سوچ سوچ کر نانم کی آنکھیں پھیل پھیل جاتیں اور جوتا کا پتی پتی اکلی کلی پروکر نظروں کے تاروں سے سہرہ گندھنے لگتا - اور یہ سہرہ اتنی بار ٹوٹا کہ اب تو نانم کی نظروں کے تار ہی اُلجھ گئے تھے -

جوتا جانتی تھی کہ نانم بے بس ہو گئی ہیں ورنہ اس بار بھی اس کا گمشدہ دل اپنی راتوں کی نیند بیچ کر وہ کسی نہ کسی طرح تلاش کر لاتیں اور جوتا کے سینے پر بڑی احتیاط سے رکھ دیتیں اور پھر سینے پر کان رکھ کر اس کی ٹک ٹک بغور سنتیں جب انہیں محسوس ہوتا کہ سب کچھ برابر ہے اور جوتا کے دل کا کوئی ٹکڑا کہیں رہ نہیں گیا ہے تو پھر وہ قلمدان کھول کر کاغذ اور قلم سنبھال لیتیں - ادھر پین سے روشنائی کاغذ تک پہنچتی ادھر نانم کی آنکھیں روشنائی پر برس کر کاغذ پر آنسوؤں کے پھول بنانے لگتیں - نانم جب تک رو سکتی تھیں کسی نے کاغذ پر بکھرے ہوئے ان پھولوں ہی کا سہرہ گوندھ لیا ہوتا - لیکن ان پھولوں کو پہچاننے کی کوئی زحمت بھی تو کرتا - تھم تھم کر سنبھل سنبھل کر کاغذ کو بچا کر آنسوؤں کو پلو میں چھپا کر نانم جب جی کا بوجھ ہلکا کر لیتیں تو پھر یہ خط سو جتن سے پاکستان اور کینیا پوسٹ کر دیئے جاتے - لکھنے سے لیکر بند کرنے تک بند کرنے کے بعد پوسٹ کرنے تک نانم سارا کام خود ہی کرتیں - ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پاکستان اور کینیا تک خطوط کے ساتھ پہنچ کر اپنے بیٹوں کے ہاتھوں میں خود ہی خطوط رکھ آتیں اور لوٹ کر ایسی زخمی نظروں سے خاندان بھر کو دیکھا ہوتا کہ ہر ماں اپنی بیٹی کی

مہندی لگانا بھول جاتی - لیکن بُرا ہو اس بیماری کا کہ نانم سے اس نے ہندستان
پاکستان کینیا بھی کچھ چھین لیا اور ان کی آنکھوں کو دوسری ہی جہاں کے اجنبی راستوں
پر بھٹکتا چھوڑ دیا - جہاں لق و دق صحرا میں لپکتے شعلوں کی زبانیں تھیں اور باغوں
میں دودھ اور شہد کی نہریں بھی لیکن نانم بضد تھیں کہ وہ ان راستوں پر نہیں چلیں گی'
اور ان کی آنکھوں میں ابھی تک پاکستان اور کینیا ہی کے راستے بسے ہوئے تھے
جن پر جونا کا ہاتھ پکڑے وہ ایڑ سیٹر خود کو گھسیٹ رہی تھیں اور اسی طرح نانم
نے اپنے مرض الموت سے چھ مہینے گزرنے پر بھی ہار نہیں مانی - اور نانم ہار
مان بھی نہیں سکتی تھیں اسی لئے کہ اب وہ قریبًا روز ہی دواخانے آنے لگا تھا -
اور نانم نے جونا کے جس سہرے کے لئے پاکستان اور کینیا کی طرف نظریں بچھا رکھیں
تھیں اسی سہرے کو اس روزانہ آنے والے نوجوان نے راستے ہی سے جیسے جھپٹ
لیا تھا اور نانم کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے لہرا لہرا کر انھیں بتلانے لگا کہ
وہ دیکھو جونا کا سہرہ میرے ہاتھ میں ہے کہو تو ڈال دوں اس کے گلے میں -
وہ لیکن نانم تھیں کہ انکار کئے جا رہی تھیں - یوں سمجھئے کہ اب نانم کی وحشت زدہ
آنکھوں کے افسانے کا دوسرا باب شروع ہو چکا تھا - وہ آنکھیں جو جونا کے
لئے زندہ تھیں، وہ آنکھیں جو جونا کے سہرے کی تلاش میں دواخانے تک چلی
آئی تھیں - وہ آنکھیں جو نوجوان کے ہاتھ میں جونا کا سہرہ دیکھ کر موت پر آخری بار
فتح پانے کی آخری کوشش میں کھلی تھیں -

پھر روز ہی آنے والے لوگوں نے جو اب بھولے سے کبھی کبھار آجاتے
تھے اپنے کانوں سے سُنا کہ وہ بلا ناغہ صبح صبح دواخانہ آجاتا ہے اور رات کو

لوٹتا ہے اور کیا پتہ کہ رات کو بھی لوٹتا ہے کہ نہیں۔

رات کو بھی لوٹتا ہے کہ نہیں۔ کیا کہا؟ ۔ کیا کہتے ہو؟

رات کو بھی لوٹتا ہے کہ نہیں۔ اوئی خدا کی مار۔

خاندان بھر کے کان ہر ہر فرد نے اپنے ہی ہاتھوں سے بینٹھ کر رس گلوں کے دونوں کی طرح بنا لئے اور ہر کان میں امرت دس یوں ٹپکنے لگا جیسے لفظ لفظ نہیں بوند بوند ہو۔

دن کو بھی سر جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں دونوں۔

اور نانی مٹ مٹ تکا کرتی ہیں گویا دونوں سے سمجھوتہ کر رہی ہوں۔

جونا اس کے سینے سے الگ جاتی ہے تو وہ نانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے۔ مٹھو بیٹے پپّی دو۔

اور نانی کی آنکھیں پنجرے سے چھوٹے ہوئے طوطے کی طرح ادھر ادھر دیکھتی ہیں پھر یہ نظریں چاہتی ہیں کہ اپنے جسم کو چھوڑ کر اپنی بینائی کو ایک جا سمیٹ کر پھر سے پاکستان اور کینیا کی طرف اڑ جائے۔

لیکن جب وہ نوجوان کہتا ہے مٹھو بیٹے پپّی دو پپّی دو۔ تو جونا کہتی ہے دیکھو نانی مسکرا رہی ہیں اور جونا ایسے میں اپنا ڈھلکا ہوا پلّو بھی برابر نہیں کرتی۔ منجھلی آپا نے جب گھس پن سنی۔ لفظوں کا امرت جب بوند بوند بن کر ان کے کانوں میں بھی ٹپکا تو انھوں نے وقت بدل بدل کر دوا خانے کے چکر کاٹنے کی ٹھانی کہ ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ منجھلی آپا لیڈی ڈاکٹر تو تھیں ہی صرف اسٹیتھس کوپ گلے میں نہ تھا لیکن جب چاہا دوا خانے جا سکتی تھیں

کوئی پابندی تھی نہ روک ٹوک۔ ڈاکٹر سند یافتہ قاتل ہوتے ہیں۔ برنارڈ شاہ
نے کہا تھا۔ اور اسٹیتھس کوپ ان کا ہتھیار ہوتا ہے جس سے وہ قاتلانہ حملہ کرتے ہیں۔ منجھلی آپا نے اضافہ کیا
تھا اضافہ کیا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹروں کو چھیڑنے کیلئے کہتیں ـــــ "میں اسی لئے تو اسٹیتھسکوپ
نہیں رکھتی۔ لیکن آج بس چلتا تو منجھلی آپا اسٹیتھسکوپ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ
سے مسلح ہو کر موئے کی تواضع کرتیں۔ اور جب وہ وہاں پہنچیں تو ساری ڈاکٹری کا طنطنہ
دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جوناخود اس نوجوان کے سینے سے لگی۔ نانم کو مٹھو بیٹے پیتی نہ پی دو
کے میٹھے میٹھے بول سکھلا رہی تھی اور نانم تھیں کہ آنکھیں پھرا پھرا کر طوطے کی طرح
دونوں کو تکے جا رہی تھیں گویا زندگی ہی سے بے وفائی کرنا چاہتی ہوں۔

کاش منجھلی آپا سمجھ لیتیں کہ قیس اور لیلیٰ جب دونوں ہی مل کر محبت کے
محاذ پر دنیا کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں تو دنیا کی خیریت اسی میں ہے کہ پیچھے ہٹ
جائے۔ لیکن منجھلی آپا بھی تو اپنی دانست میں خود کو ایک دنیا سمجھتی تھیں سو انھوں نے
ذرا دیر میں شکست تسلیم کی۔

جوناکے ماما کو یہ خبر عین اس وقت ملی جب کہ انھوں نے پانچ دن کے
مراقبے سے سر اٹھایا تھا۔ کلمہ پڑھا۔ کچھ سوچا۔ اس کے بعد پھر کلمہ پڑھا۔ پھر بہت
بگڑے بہت طیش میں آئے۔ زلفوں کو نوچا۔ داڑھی اینٹھی۔ دو اخل نے پہنچے۔ ڈانٹ
ڈپٹ کی۔ پھر سمجھایا منایا بھی۔ آخر شش ہارمانی تو یہاں تک کہہ دیا کہ جونا کا
رشتہ اسی نوجوان سے ہو گا۔ لیکن خدارا کھلے بندوں محبت کے اس ڈرامے
سے تو اجتناب کرو۔

لیکن جونا اور نوجوان نے اعلان کر دیا تھا۔ جن کی آنکھوں میں تاب
نظارہ ہے وہ دیکھیں اور نہیں تو آنکھیں میچ لیں۔

اب نانم کی طویل تر بیماری نے جونا سے اس بوریت کا احساس

بالکل چھین لیا جو کبھی اس کے حصے میں آ رہا تھا اور جس کا انکشاف وہ کسی کے سامنے بھی کر نہیں سکتی تھی لیکن اب تو جونا کا جی چاہتا تھا کہ نانم برسہا برس یونہی پڑی رہیں۔ اور ان کی تیمارداری کا سلسلہ اتنا طویل ہو جائے کہ جونا بس ان کی خدمت ہی میں لگی دن رات ایک کر دے۔

اور صبح ہی سے جونا کی نظریں اسی راستے سے لگ جائیں جدھر سے وہ آنے والا ہوتا۔

نانم نے مجھے پالا پوسا۔ یہی نا کہ سینہ چوا کر دودھ نہیں پلایا۔ سینے سے لگا کر تو رکھا۔ بھلا ان کی خدمت اب میں نہیں تو کون کرے گا۔

اور جونا نے نانم کی خدمت گذاری ہی میں اپنی پروان چڑھتی ہوئی نئی محبتوں کی لذتیں اور نعمتیں کچھ ایسی صفائی سے چھپا لیں کہ خاندان کا کوئی ترم خاں بھی انگلی اٹھانے کی جراءت نہ کر سکا۔

جونا کا موقف بہت مضبوط تھا۔ اس کی محبت کی چغلی کھانے والے سر اگر اس کو نانم کے مورچے سے ہٹاتے تو دوسرا فریضہ یہ بھی تو ادا کرنا ہوتا کہ جونا کی جگہ پر کرنے کے لئے نانم کی خدمت میں جت جاتے۔ کون مائی کا لال ایسا تھا جو اس سانس لیتی ہوئی لاش کو گلے کا ہار بناتا۔ سب کے گھر بار تھے۔ سب کی اپنی اپنی اچھی بری زندگیاں۔ اور نانم کی آنکھیں تھیں کہ پتھر بن کر بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہی آنکھیں جو پاکستان اور کینیا سے جونا کیلئے پھولوں کے ہاروں کے انتظار میں اب خود ہی اس کے اور اس کے چہیتے نوجوان کے گلے کا ہار ہو گئی تھیں۔

نانم اب سچ پوچھو تو ایسی گٹھڑی تھیں جس میں جونا نے اپنے نئے پرانے رومانس

چھپا رکھے تھے اور نائم نے اپنی ادھوری ہستی کو بھی شاید اسی لئے بکھرنے نہ دیا کہ کہیں جونا کے یہ ڈھکے چھپے رومانس کسی کو نظر نہ آجائیں۔ اور اب اس گٹھری کو اٹھائے پھرنا کسی کے بس کا روگ بھی نہ تھا اور یہ یوں بھی اچھا ہوا کہ جونا کے رازوں کی پوٹ جونا ہی کے تصرف میں رہی۔ وہ بڑے جتن سے اپنی نئی محبت کی نعمتیں نائم جیسی بوسیدہ گٹھری میں چھپاتی رہی۔ جس کو کھولنے میں اب کسی کو دلچسپی ہی نہ تھی۔

جہاں اس گٹھری میں جونا کی چھوٹی بڑی محبتوں کے دفینے چھپے تھے وہیں وہ محرومیاں بھی چھپی تھیں جو پاکستان اور کینیا سے پھولوں کے گجروں کے انتظار میں نائم کو ملی تھیں۔

آخرش ہوا یہ کہ نائم کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں کھوئی ہوئی نظروں نے ان اجنبی راستوں میں خود کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جو اپنے شعلوں اور شہد کی نہروں کی طرف کہیں جاتے تھے۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ نائم نے موت سے ہار مانی تو زندگی پر فتح پا کر مانی۔ جس شام جونا اپنی ایک سہیلی کو نائم کے پاس بٹھا کر نوجوان کے ساتھ چلی گئی تو نائم نے آنکھیں جھپکانے کی آخری کوشش یوں کی کہ اس کے بعد آرام سے سولیں گی۔ اور جب جونا صبح ہوتے ہوتے لوٹ آئی تو اس کی سہیلی نے بڑے چاؤ سے جونا سے سب کچھ پوچھا۔ جونا نے شرم و حیا کا پیکر بن کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بات آگے بڑھی۔

"صرف قاضی صاحب تھے اور ان کے دو دوست گواہ کے طور پر تھے اور" اور تیرا عاشق زار وکیل بنا تھا۔" جونا نے سہیلی کی ران میں چٹکی بھر کر اس طرح کہا جیسے رات کی لذتوں کا باسی مزہ چکھ رہی ہو۔

اور سہیلی نے مبارکباد دی۔ گلے سے لگایا، پیشانی چومی، گال چومے پھر آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اور جونا نے شرما کر دوپٹہ برابر کر لیا۔

اور جب جونا نانم کی طرف "مٹھو بیٹے پئی دو" کہہ کر رجوع ہوئی تو۔ "مٹھو بیٹیا" اس بوسیدہ قفس کو چھوڑ کر اجنبی فضاؤں میں پرواز کیلئے اپنے بے جان بازوؤں کو سمیٹ سمیٹ کر پھیلانے کی سعی کر رہا تھا اور آنکھیں تھیں کہ جونا کو اسطرح تکے جا رہی تھیں جیسے سب کچھ جان گئی ہوں۔ ان آنکھوں میں نہ مروت تھی، نہ سفاکی، نہ محبت تھی نہ نفرت، نہ امید کی کرن تھی نہ محرومی کا سایہ۔ کچھ بھی تو نہ تھا، کچھ بھی تو نہ تھا۔ لیکن ان سارے جذبوں کی میت اٹھائے ہوئے ایک ایسا درد ان آنکھوں میں تھا جسے دیکھا نہیں سوچا جا سکتا ہے۔

اور جب دوا خانے سے گھر منتقل کی جانے کے بعد نانم کی میت اٹھی تو سارا خاندان پھر جمع ہو گیا تھا۔ منجھلی آپا کی حالت غیر تھی اور لپ اسٹک اب ان کے ہونٹوں پر نہ تھی۔ ان کے شوہر جانی پہچانی خواتین سے منت سماجت کر رہے تھے کہ وہ منجھلی کو سنبھالیں۔ ایک پٹس تھی ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ اس کے غم کی طرف دوسرا توجہ کرے۔ ماما کے معتقدین کا انبوہ کثیر باہر جمع تھا اور ماما زلفیں نوچ نوچ کر آیتیں پڑھتے جاتے اور بیچ بیچ میں یک لخت خاموش ہو جاتے تھے۔

اور جونا کسی اکیلے گوشے میں کسی چوڑے چکلے سینے پر سر رکھے نانم کی رفاقتیں یاد کر کر کے تڑپ رہی تھی۔

نانم دنیا سے یوں اٹھیں جیسے رازوں سے ٹھنسی ایسی گٹھڑی ہوں جسے لوگوں نے میت کا نام دے کر آخری بار بھی کچھ چھپانے کی کوشش کی ہو۔ اور وہ نانم جنھیں سروں پر اٹھنا تھا کندھوں پر چل پڑیں۔

# جہاں میں ہوں

حمدو بھاگا بھاگا آیا اور اس کمرے تک چلا آیا جس کو نئے دولہا دلہن نے ابھی تک بند کر رکھا تھا۔ دروازے کے بالکل قریب وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک آدھ پٹ بھی کھلا ہوتا تو وہ شاید ڈرتا ہوا گھس جاتا لیکن جب آہستہ سے دروازے کو دھکا دے کر اس نے دیکھا تو دروازہ اندر سے اچھی طرح بند تھا اور حمدو کے سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ مگر بہت بے چین تھا۔ بہت مضطرب۔ اس لئے کہ جو خبر وہ سنانا چاہتا تھا وہ نہ صرف بہت اہم تھی بلکہ اس کی اپنی دانست میں ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس خبر کو سارے محلے میں پھیل جانا چاہیئے تھا اس نے تڑپ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ بات تو جانتا تھا کہ دولہا دلہن سوئے ہوں تو دروازے دیر تک بند رہتے ہیں۔ کھٹ کھٹا کر مخل ہونے سے وہ ڈرتا تھا۔ لہذا اپنی پھٹی ہوئی نکر کو برابر کرتے ہوئے وہ برآمدے سے نکل کر دالان تک پہنچا کہ شبیر چچی کو ہی سب بتادے

لیکن وہ تو مصلّے بچھائے پلّو سے سر ڈھکے ادائی نماز کے بعد اپنے سر کو ایسی زور زور سے جنبش دیکر کوئی وظیفہ کا ورد کر رہی تھیں کہ دالان میں صرف ان کے منہ مانے کی آواز کے ساتھ ساتھ سر کو جنبش دیتے وقت جو ایک خاص قسم کی خرخر سی نکلتی تھی بس وہی سنائی دیتی تھی۔

حمدو کے لئے اب زیادہ انتظار کرنا مشکل تھا۔ اس فرض کی ادائی اس نے اپنے ذمہ لے لی تھی کہ سارے پڑوسیوں کے کانوں تک اس اہم ترین خبر کو اپنی غلیل کے کنکر سے زیادہ سرعت کے ساتھ پہنچادے گا۔ جو درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیاؤں تک پلک جھپکنے میں پہنچ جاتا ہے۔

حمدو نے سوچا ہوگا کہ اس گھر میں تو کوئی کمرے میں بند ہے۔ کوئی خول میں ــــــ کمرے کا دروازہ تو مضبوط تھا جو کھل نہ سکتا تھا۔ حمدو نے وظیفہ پڑھتی ہوئی شبیر چچی ہی کو خول سے باہر کھینچ لانا عین سب سمجھا اور آگے بڑھ کر جانماز ہی پر انھیں جا لیا اور کان کے قریب جا کر کہا "چچی قرقی آئی ہے سنتی ہو چچی قرقی آئی ہے۔"

اب اور زیادہ وقت حمدو ضائع نہ کر سکتا تھا۔ اس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ شبیر چچی نے وظیفہ کی خرخر بھی آنکھیں بند رکھ کر جاری رکھی ہے اور بات بھی سن لی ہے۔ چنانچہ وہ پلٹا اور اپنی نکر برابر کی اور بگٹٹ بھاگتا حاجی اسداللہ کے دروازہ پر جا پہنچا۔

حاجی اسداللہ صبح کی پہلی بیڑی جلاتا ہوا اس کو دروازہ پر ہی مل گیا۔

"سُنا حاجی نانا" حمدو نے بڑی سنجیدگی سے کہنا چاہا

"پہلے سنا تو مردود۔ سُناتا تو کچھ نہیں ہے۔ کہے جاتا ہے سُنا ہے سُنا ہے"

"نانا قرقی آئی ہے قرقی"

حمدو نے اس طرح تن کر کہا جیسے رعب جتا رہا ہو۔

"تو آنے دے قرقی کے یار۔ رکھلے اپنے گھر جروابنا کر" لیکن حاجی اسداللہ کو جب بات کی اصلیت سمجھ میں آئی تو وہ چونکا۔ کیا کہا قرقی آئی ہے؟ لیکن حمدو تو پھٹی ہوئی نکر پر ہاتھ دھرے اپنے چوتڑ چھپاتا بھاگ رہا تھا اور جب حاجی اسداللہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ روپ متی کے دروازہ پر کھڑا اطمینان سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا تھا۔

"آنٹی دروازہ کھول آنٹی"

آنٹی نے تو دروازہ کھولا نہیں لیکن دروازہ کھُل ضرور گیا دروازہ کھولنے والا کملیش تھا۔ حمدو سے عمر میں بس سال دو سال کا بڑا ہوگا۔

"آنٹی کیا کرتی ہے" حمدو نے اپنی اہمیت جتائی

"سورہی ہے جی، تمہیں کیا کام ہے بتلاؤ؟" کملیش نے حمدو کو لفٹ ہی نہیں دی۔

لیکن حمدو کہاں ماننے والا تھا۔ اُسے علم تھا کہ جو بات وہ کہنے جارہا ہے اُس کی اہمیت بھلا کملیش کہاں جان سکتا ہے۔ قرقی آئی ہے تو گھر پر کیا گذرجاتی ہے، مکینوں پر کیا بیت جاتی ہے۔ اس کی اہمیت سے حمدو واقف تھا۔

لہذا اُس نے بڑے اعتماد سے کملیش سے کہا۔

"مجھے ذرا آنٹی ہی سے بات کرنی ہے"

کملیش کو حمدو کی یہ رعونت بُری لگی اس نے تڑاخ سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "جاگ پڑے تب آنا"۔

لیکن حمدو نے دھکا دے کر پھر سے دروازہ کھولنا چاہا جو پوری طرح کھلا نہیں اس لئے کہ کملیش پٹوں سے لگا کھڑا تھا۔ بلّی کی طرح بدن چرا کر وہ ادھ کھلے پٹ میں سے اندر گھس گیا اور سینہ تان کر کملیش سے کہنے لگا۔

"اٹھاؤ آنٹی کو ورنہ پھر راستہ نہ روکو میرا۔ میں خود اسے جگا لوں گا"

اور کملیش کے جواب کا انتظار کئے بغیر حمدو نے تڑپ کر راستہ کاٹا اور کمرے میں داخل ہو کر روپ متی کو جھنجھوڑ دیا وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو حمدو نے کہا۔

"اُٹھو بھی جلدی آنٹی قرقی آ گئی ہے، قرقی" وہ کچھ اس طرح کہہ رہا تھا جیسے اس کو سب پتہ تھا کہ قرقی آنے والی ہے۔

"کون ہے یہ قرقی" روپ متی بولی۔

"ارے" حمدو نے تعجب سے کہا۔

"ارے تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم آنٹی کہ قرقی کیا ہوتی ہے۔ ارے آنٹی قرقی آتی ہے تو گھر کا سارے کا سارا سامان کچہری میں لے جایا جاتا ہے فرنیچر، الماریاں ریڈیو یہ سب تو پہلے ہی دھر لئے جاتے ہیں۔ پھر کپڑا لتا ہانڈی برتن بھی تو نہیں بچتے"

روپ متی جان گئی کہ قرقی کیا ہوتی ہے لیکن وہ سمجھ نہ سکی کہ اس کے

گھر قرقی کیوں آئے گی۔ اس نے حمدو کا ہاتھ پکڑ کر بڑی راز داری سے کہا۔

"حمدو قرقی میرے گھر نہیں آئے گی ہے۔ میں کسی کا کچھ دینا لینا نہیں ہوں۔

لیکن حمدو چوکنے والا کہاں تھا۔ تین سال سے اس کی آنکھوں نے ہر سال قرقی کو دیکھا تھا جو معشوق علی کے احاطے میں ہر کرایہ دار کے گھر وبا بن کر آتی ہے۔

حمدو نے روپ متی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"آنٹی تو تو سچ مچ کچھ نہیں جانتی۔ تیرے گھر قرقی اس طرح آئے گی جیسے اس احاطے کے سارے کرایہ داروں کے گھر آتی ہے۔"

روپ متی کو اس احاطے میں آئے ہوئے کوئی تین ماہ ہوئے تھے وہ کسی کالج میں پڑھاتی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی کملیش اور ایک بہن تارا متی کے ہمراہ رہتی تھی جن کی وہ کفیل تھی اور سرپرست۔ احاطے کے مرد روپ متی کا اس لئے مان کرتے تھے کہ وہ احاطے بھر میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی عورت تھی قبول صورت تھی اور ملنسار تھی اور سب سے زیادہ بڑی بات یہ تھی کہ وہ کسی کی بیوی نہیں تھی۔ مرد اس سے ملتے جلتے تھے تو کوئی ایسا خوف ان کے دلوں میں نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت پر غاصبانہ قبضے کی سوچ رہے ہیں اور اپنی اس خصوصیت اور وصف کے ناتے کہ روپ متی بیاہتا نہ تھی وہ احاطے بھر کی عورتوں کی آنکھوں میں کنکر بن کر کھٹکتی تھی۔

حمدو ہاتھ چھڑا کر بھاگ گیا تو روپ متی نے جلدی جلدی کپڑے

درست کئے اور اس تجاہل سے باہر نکل آئی جیسے ترقی کی نسبت معلومات کرنا نہیں چاہتی بلکہ کملیش امرتا رائی کی سرزنش کرنا چاہتی ہے کہ ادھر صبح ہوئی نہیں کہ یہ لوگ نکل پڑے کد کڑیاں بھرنے۔

لیکن جب وہ کھلے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی بالکنی پر آئی تو ایک سراسیمگی سی جوار میں پھیلی ہوئی تھی۔

عورتیں دروازوں کے پٹوں میں ادھ کھلی کھڑکیوں میں جالی دار برآمدوں میں دبی چھپی باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں ایک موٹر وین میں ایک بھاری بھرکم کالا بھجنگ افسر تن کر بیٹھا ہوا تھا اور میونسپلٹی کی اصیلیں اور جوان اور باوردی انسپکٹر بڑی رعونت سے گھر والوں کی نقل وحرکت کو نظر میں رکھے اپنے حاکم کے احکام کے منتظر تھے۔

اب روپ متی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حمّو نے جو خبر اس تک پہنچائی ہے وہ کچھ ایسی ناقابل اعتنا بھی نہیں ہے بلکہ دل ہی دل میں وہ اس کی اہمیت کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کو کچھ عجوبہ سا لگ رہا تھا جب وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر اور آنکھیں مَل مَل کر سوچ رہی تھی کیسی "ضبطی" ہے کہ احاطے کے سارے لوگ اتنے ہراساں ہیں جیسے ضبطی ان ہی کے گھر آئی ہو۔

احاطے بھر میں صرف روپ متی ہی ایسی تھی جو ترقی کے بجائے ضبطی کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ یہ بات بھی اس احاطے میں اس کے نووارد ہونے کی دلیل تھی۔ ورنہ احاطے کا ہر چھوٹا بڑا ترقی کے لفظ سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔

روپ متی نے سوچا کہ باہر نکل کر معلوم کرنا چاہیئے کہ آخر یہ ضبطی کس کے گھر ہے ۔ سب سے پہلے اس کو گمان ہوا کہ ضبطی شاید مقابل کے مکان پر ہی آئی ہوگی جو ایک اردو ادیب کا مکان ہے ۔ روپ متی جانتی تھی کہ اس کے گھر اکثر قرض خواہوں کی یورش رہتی تھی ۔ جن سے یہ ادیب نرم گرم باتیں کیا کرتا تھا ۔ راتوں کو یہ سارے محلے سو جاتے تو جاگ کر اوٹ پٹانگ کچھ لکھتا تھا اور بڑی تیزی سے بوڑھا ہو رہا تھا ۔

روپ متی نے ننگے پیر ہی اس کے گھر کا رخ کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جالیدار برآمدے میں کھڑا ادیب کی بیوی سے گھل مل کر باتیں کر رہا ہے جب وہ قریب پہنچی تو اس نے دیکھا ادیب تہبند باندھے نل کے نیچے اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ بیٹھا بچے کو نہلا رہا تھا اور خود بھی نہا رہا ہے ۔ باپ بیٹے صابن کا جھاگ اڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر پانی پھینکنے، کلیلیاں کرنے میں مگن تھے ۔ روپ متی نے اندازہ لگا لیا کہ ادیب کے گھر تو سب خیریت ہے پھر آخر وہ بدنصیب ہوگا کون جس کے لئے میونسپلٹی نے یہ سب اہتمام کیا ہے ۔

شبیر چچی تسبیح ہاتھ میں لئے اس کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں جس میں اس کا بیٹا اور دلہن بند تھے ۔ وہ خود بھی دروازہ کو آہستہ بجاتیں ۔ کبھی اس طرح باہر کی طرف دیکھتیں جیسے خود کچھ دیکھنا نہیں چاہتی ہوں بلکہ ان نظروں سے بچنا چاہتی ہوں جو انھیں دیکھ رہی تھیں اور سچ پوچھیئے تو انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا ۔ ان کا بیٹا اور بہو شاید رات اتنا جاگے تھے کہ ابھی تک ان کی صبح نہیں ہوئی تھی ۔

لیکن اصیلیں تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر حمیدہ بانو کے گھر جا گھسی تھیں۔ حمیدہ بانو معشوق علی کی بیوہ بہو تھیں، اور اب جبکہ معشوق علی اپنے کاروبار کے سلسلے میں ضلع پر رہنے لگے تھے تو بانو ہی کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتیں۔ یو پی کے کسی ضلع کی خاتون تھیں اپنی چرب زبانی اور نکھرے ستھرے لہجے پر اس حد تک ناز تھا کہ کسی حیدرآبادی عورت کو خاطر ہی میں نہ لاتیں۔ عمر کے تقریباً ۴۵ سال کھا چکی تھیں لیکن چہرے کو لیپ تھوپ کر جوان نظر آنے کی کوشش میں بڑی محنت شاقہ سے کام لیتیں۔ سارے کرایہ دار حمیدہ بانو کی کچھ اسطرح عزت کرتے جیسے بے گار کر رہے ہوں۔

جب روپ متی نے اصیلوں کو حمیدہ بانو کے گھر میں اطمینان سے اِدھر اُدھر پھرتے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ معشوق علی کی بہو جو کرایہ داروں کی بیگم صاحبہ بھی تھی اور جس کی زبان سے پھولوں کی بجائے خزاں رسیدہ درخت کی پتیاں جھڑتی تھیں ایسی مری مری سی چپ چاپ سی کھڑی ہوئی ان اصیلوں کو تک رہی تھی جیسے جنم جنم کی گونگی ہو۔ روپ متی نے اس کو جب یوں بے بس دیکھا تو ترس کھا کر رہ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ ادیب کی بیوی سے اس ضبطی کی نسبت کچھ استفسار کرتی، ادیب کی بیوی نے اپنی کہنی سے ٹہوکا دے کر اس کو کچھ بتلایا۔ روپ متی نے غور سے دیکھا کہ پہلوان نما مولوی کھٹ کھٹ کمروں کو مقفل کر رہا ہے اور جب وہ اپنا کام کر چکا تو اس نے حمیدہ بانو کو سر ہلا کر اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کام مکمل کر چکا ہے۔ مولوی کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ حمیدہ بانو کو اپنی کھوئی ہوئی گویائی مل گئی۔

"یہاں کیا پھر رہی ہو پاٹ جلی مرغیو۔ یہ کوئی معشوق علی صاحب کا مکان تو ہے نہیں۔ وہ سب مقفل کرکے مزے میں بزنس کرتے ہیں۔ اور تم ہو کہ ہم کرایہ دار ہیں

کو ناکس چنے چبوا رہی ہو ۔ اپنے انسپکٹر صاحب سے کہو کہ وہ خود آ کر اپنی آنکھوں معشوق علی صاحب کے کرتوت دیکھ جائیں ۔ قفل توڑ کر سامان اٹھوالیں یا سیل بند کر کے مہر توڑے لگوادیں ۔ آؤ ۔ آؤ نہ میرے ساتھ ۔ میں بتلاؤں تمہیں کہ انہوں نے اپنا سامان کہاں رکھ چھوڑا ہے ''

اور حمیدہ بانو نے بڑھ کر دونوں اصیلوں کا ہاتھ تھام لیا اور لے چلیں ساتھ ساتھ ۔ مقفل کمروں کو بتلا کر کہا '' یہ رہا ان کا مکان ۔ یہ ہے ان کے مقفل کمرے جن میں اتنا سامان چھپا پڑا ہے کہ قرقی کی رقم سامان کو کوڑیوں کے مول بکوا کر بھی حاصل کی جا سکتی ہے '' یہ وہی کمرے تھے جو پہلوان نما مولوی نے ابھی ابھی مقفل کئے تھے اور اشارہ پلتے ہی حمیدہ بانو نے لن ترانی شروع کر دی تھی ۔

حمدو یہ ساری کاروائی دیکھتا کھڑا تھا اور حمیدہ بانو کی باتوں پر مسکرا رہا تھا اور بھول گیا تھا کہ اس کی نکر پھٹی ہوئی ہے ۔ اصیلوں نے الٹے پاؤں لوٹ کر انسپکٹر کو بلایا ہے ۔

روپ متی کا ہاتھ دبا کر ادیب کی بیوی نے کہا ۔ دیکھا تم نے کیا دن دھاڑے آنکھوں میں مٹی جھونک دی بانو نے ۔ روپ متی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس تکتی رہ گئی ۔

حاجی اسداللہ اپنا پٹارہ ریڈیو اٹھائے چھپا کے سے بیت الخلا میں گھس گیا جسے آپ لاوٹری بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس لئے کہ حاجی اسداللہ خود اسے '' لاٹری '' کہنے لگا ہے ۔ جب سے فلش سسٹم اس کے گھر آیا ہے ۔

انسپکٹر نے احاطہ کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اس ساری

وسیع عمارت کا میونسپلٹی نمبر چونکہ ایک ہے اس لئے از روئے قانون اس کے مختلف حصّوں میں جو کرایہ دار ہیں وہ اگر کرایہ دار ہوں بھی تو معشوق علی ہی تصوّر کئے جائیں گے اور ان کا سامان معشوق علی کا سامان متصور ہوگا ۔ ایسے میں جبکہ اتنے سارے گھر کھلے ہوں ہمیں بند کمروں کی قفل شکنی کا کوئی جواز نہیں۔

"سمجھ گئیں" ادیب کی بیوی نے روپ متی کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔

" یعنی تم بھی معشوق علی ہو میں بھی معشوق علی! روپ متی نے ادیب کی بیوی کو اس طرح دیکھا جیسے کھڑی اپنا بھائیں بھائیں کرتا ہوا گھر دیکھ رہی ہو جس کا سارا سامان قرق کیا گیا ہو۔

" بولو نا اب ہم کیا کریں ؟"

روپ متی زیادہ فکر مند ہو رہی تھی۔

حمیدہ بانو نے برابر انسپکٹر کو باتوں میں الجھائے رکھا تھا۔

" واہ! واہ یہ اچھا قانون ہے سب تو موج اڑائیں اور شحنۂ شہر عزت داروں پر رعب کسے ۔

لیکن اصیلوں نے انسپکٹر کا اشارہ پا کر احاطہ میں رینگنا شروع کر دیا تھا ۔

ایک اصیل ظاہر میاں کی کبڑی بیوی سے اُلجھ رہی تھی جو اسے اپنے کمرے میں داخل نہ ہونے دیتی تھی - یہ کمرہ بھی کیا تھا دراصل تہہ خانہ تھا جو ظاہر میاں آکشنر کا مکان کہلاتا تھا۔ کبڑی بضد تھی کہ پہلے حمیدہ بانو کا سامان اٹھاؤ تب ادھر نظر کرنا۔ انسپکٹر نے سمجھایا کہ ہم ابھی کسی کا سامان نہیں اُٹھا رہے ہیں صرف یہ دیکھ رہے ہیں کونسا

سامان کہیں اٹھانا ہے اور کونسا چھوڑ جانا۔ اگر کسی نے کوئی چیز پار کرنے کی کوشش کی تو اس کے حق میں بُرا ہوگا۔

"ارے پار نہ کریں تو کونسا اچھا ہو جائے گا کسی کے حق میں ہم اپنا سامان پار نہ کریں تو تم کر لو گے ہمارا سامان پار۔ اے ہم کو ایسے داروں پر اچھی اعتماد پڑی ہے۔"

حمیدہ بانو کہے جا رہی تھی۔

گُڑی نے حمیدہ بانو کو اس طرح تڑپ کر دیکھا جیسے مقتول آخری نگاہ اپنے قاتل پر ڈالتا ہے۔ گُڑی کا بس چلتا تو وہ انسپکٹر کو کسی قدر تفصیل سے بتلا دیتی کہ یہ حمیدہ بانو جو تمہارے دماغ کا اپنی لن ترانی سے کچومر بنا رہی ہے۔ دراصل اس احاطہ کی مالکن ہے۔ معشوق علی کی بہو ہے اور یہ مستنڈا مولوی اس کا ہوتا سوتا ہے جو فارسی اور عربی پڑھانے گھر میں داخل ہوا تھا پھر واپس لوٹنے کا راستہ ہی بھول گیا اور مفت کی کھاتا ہے۔ معشوق علی بیچارے تو اپنی بہو کے اطوار دیکھ کر گھر چھوڑ گئے وہ کچھ اور دن یہاں رہتے تو گھر کیا انھیں دنیا ہی چھوڑنی پڑتی۔

گُڑی نے جب آخری نظر حمیدہ بانو پر ڈالی تب تک تو اصیلیں اس کے تہہ خانے میں گھس چکی تھیں اور ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔

حاجی اسداللہ کی خوبصورت لڑکی آنسو پونچھ کر اپنے رنگ برنگے شرٹس اور شلواریں صندوق میں سے نکال کر ایک اصیل کے سامنے ڈال رہی تھی۔

روپ متی نے ادیب کی بیوی سے پوچھا کہ سب اس قدر پریشان ہیں اور تمہیں کوئی تشویش نہیں تو اس نے منہ پھلا کر کہا کہ "روپی" اب جو ہونی ہے

سو ہو کر رہ گئی ہی - احاطے میں ہر سال قرقی آتی ہے ـــــــ معشوق علی کی بیوہ جو مالکن بن کر برس کے بارہ ماہ کرایہ داروں پر حکومت چلاتی ہے اسی ایک دن کے لئے خود بھی کرایہ دار بن جاتی ہے اور سب سے زیادہ مظلوم نظر آتی ہے۔ مستنڈا مولوی بڑی مشاقی سے ان کمروں کو مقفل کر دیتا ہے کہ چابیاں معشوق علی کے پاس ہیں۔ اصیلیں سڑ بڑ پھرتی رہتی ہیں۔ حمیدہ بانو اپنی زبان قینچی کی طرح چلاتی رہتی ہے اور کسی نہ کسی کرایہ دار کا مال دھر لیا جاتا ہے۔ قرق کئے ہوئے اس سامان سے ٹیکس کی رقم اس طرح وصول ہو جاتی ہے کہ کرایہ دار بےچارہ جس کا سامان قرق کر لیا جاتا ہے کسی نہ کسی طرح رقم بھر کر اپنی چیزیں چھڑا لاتا ہے اور ماہ بہ ماہ کرائے میں سے وضع کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ معشوق علی کو اطلاع دیدی جاتی ہے اور وہ چین سے اپنے دھندے میں لگے رہتے ہیں" وہ مسلسل کہتی گئی اور روپ متی پلک جھپکائے بغیر اسے تکتی رہی۔

"حمیدہ بانو اپنے گھر براجتی ہیں اور پھر دوسرے ہی دن سے مالکن بن بیٹھتی ہیں۔ مستنڈا مولوی سانڈ کی طرح بڑا اینڈتا اور حمیدہ بانو کو فارسی عربی میں عشق کا درس دیتا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے پڑوسی کا سامان قرق ہوا ہے۔ وہ بدنصیب جس کا سامان اٹھا لیا جاتا ہے وہ تنہا میونسپلٹی کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ ہمارے گھر نہ ریڈیو ہے نہ بجلی کے پنکھے نہ سینے کی مشین نہ بڑی بڑی الماریاں۔ ان کی بڑی سی ہیز تھی سو وہ پچھلے سال اور لوگوں کے سامان کے ساتھ قرق کر لی گئی تھی"

"لیکن میرے پاس تو یہ سبھی کچھ ہے؟" روپ متی پر رقت طاری

ہو رہی تھی۔

"کسی کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا ہوتا اور انسپکٹر سے کہہ دیا ہوتا کہ یہ کمرہ کسی اور کرایہ دار کا ہے۔ دیکھا نہیں اب حمیدہ بانو کس طرح آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں۔

روپ متی لوٹنے لگی۔ کہا بہن ذرا دیکھ آؤں اپنا گھر کتنی ہی تو ابا مرحوم کی نشانیاں ہیں"۔

اور وہ ساری کی ساری گٹھریاں سنبھالتی جب ادیب کے گھر سے باہر نکل رہی تھی تو دروازے میں حمید واس سے ٹکرا گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔

"آنٹی افسر نے تیرا سامان اٹھا لینے کا حکم دیا ہے اور انسپکٹر تیرے گھر سے سامان نکلوا رہا ہے اور تارا سسٹر اور کملیش بھیا رو رہے ہیں تارا سسٹر تو بہت بہوت رو رہی ہے"

روپ متی دھڑکتے دل کو تھام کر ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتی اپنے گھر تک پہنچی تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسو تھے کہ امڈ امڈ کر آنکھوں تک چلے آتے تھے اور وہ پلکیں جھپکا جھپکا کر ان آنسوؤں کو پیچھے ڈھکیل دیتی تھی۔

جب وہ بدحواس سی اپنے گھر میں داخل ہوئی تو انسپکٹر نے اس کو نظر بھر کر دیکھا لیکن وہ اپنے اٹھتے ہوئے سامان کو دیکھ رہی تھی ـــــ اسے اپنی اتنی سدھ بدھ بھی نہ تھی کہ ڈھلکا ہوا آنچل ہی برابر کر
اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم کرایہ دار ہیں" اس نے انسپکٹر سے کہا۔

"آپ کچھ کیجئے نہ۔ کرتا کون ہے بھوگتا کون" اور روپ متی نے محسوس کیا کہ کچھ اور وہ کہے گی تو رو پڑے گی۔

انسپکٹر نے اس کی بھیگی ہوئی پلکیں دیکھیں تو پوچھا "کوئی مرد نہیں ہے اس مکان میں؟"

روپ متی نے طوفانوں کو روکنے کے لئے جتنے بند باندھ رکھے تھے وہ ایک دم سے ٹوٹ گئے اور آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا "ہمارا کوئی نہیں ہے۔ میں تارا اور کملیش بس یہی سب کچھ ہیں"۔

انسپکٹر نے محسوس کیا کہ روپ متی کو کسی مرد کا ایسا سہارا چاہیئے کہ جو گھر کے اٹھتے ہوئے اثاثہ کے لئے سینہ سپر ہو سکے ——— اسے ایسا لگا کہ روپ متی کا عورت پن ہی سرے سے ترق کر لیا گیا ہے اور وہ تو اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی پرورش کا ایک ذریعہ ہے جو آہستہ آہستہ بھول رہا ہے کہ آنچل ڈھلک جائے تو اسے برابر کر لینا چاہیئے۔ جب کہ کسی مرد کی بھوکی نگاہیں اسے تک رہی ہوں۔

لیکن روپ متی تو سب کچھ بھولی ہوئی اپنے اٹھتے ہوئے سامان اور روتی ہوئی بہن کو تک رہی تھی اور جب اس نے خود اپنے آنسو خشک کرنے کے لئے آنچل سمیٹا تو انسپکٹر نے کہا "میں پوری کوشش کروں گا کہ رقم ادا کر کے آپ کا سامان واپس لے آؤں۔ آپ کرایہ ہر ماہ مالک مکان کو ادا کرنے کی بجائے اس رقم کی ادائیگی تک مجھے دیا کریں۔ کہیئے منظور ہے نا"

روپ متی نے قبل از قبل ہی اس کے احسان کا اعتراف کیا اور ایسی بے بس نظروں سے اُسے دیکھا جیسے احسان اٹھانے اور بک جانے کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

انسپکٹر نے کچھ سوچ کر روپ متی سے کہا۔

گھر کی یہ ساری چیزیں آپ کو بہت پیاری ہوں گی۔ کیوں ہے نا"

روپ متی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر آپ یوں کیجئے" وہ کہنے لگا کہ "ہمارے افسر سے ہفتہ بھر کی مہلت لے لیجئے۔ اس سے کہئے کہ رقم ایک ہفتہ کے اندر اندر آپ ادا کر دیں گی اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ سامان قرق کر سکتے ہیں"۔

"مان جائیں گے وہ؟"

روپ متی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"آپ کہیں گی تو مان ہی لیں گے" ——— انسپکٹر نے فلم کے ہیرو کی طرح جواب دیا۔

روپ متی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس طرح موٹر وین کی طرف بڑھی جیسے دلہن ڈولی میں سوار ہونے جا رہی ہو۔ جب وہ افسر سے بات کر کے لوٹ رہی تو انسپکٹر اس کا اٹھایا ہوا سامان اس کے گھر میں واپس رکھوا رہا تھا۔

"مبارک" انسپکٹر نے روپ متی کو برابر سے گذرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"کتنی مہلت دی ہے" روپ متی نے پوچھا۔

"صرف تین دن" ـــــــ انسپکٹر نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوگا" ـــــــ روپ متی نے اس قدر بے اختیار ہو کر انسپکٹر سے پوچھا جیسے اس کو اس کا وعدہ یاد دلا رہی ہو ـــــــ پھر خود ہی خود سوچ کر جھینپ گئی۔

انسپکٹر بڑے اعتماد سے مسکرا دیا۔ اس نے کہا" ہو جائے گا سب کچھ"

جب میونسپلٹی کے لوگ لوٹنے لگے تو اڑوس پڑوس کے وہ لوگ جو روپ متی کا سامان اٹھتا ہوا دیکھ کر جمع ہو گئے تھے آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔ میونسپلٹی وین جانے لگی تو حمدو نے سپاہی کی طرح افسر کو سلوٹ کیا۔ حمدو بڑا خوش خوش نظر آ رہا تھا وہ بھول گیا تھا کہ اس کی نکر پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے۔

مستنڈا مولوی آنکھ مار کر حاجی اسد اللہ سے کہہ رہا تھا" معاملہ نپٹا لیا ہوگا۔ روپ متی بڑی عشوہ طراز ہے"

حمدو جب روپ متی کے گھر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو کملیش نے قریب قریب اس سے چمٹ کر کہا" چاکلیٹ کھائے گا۔ حمدو۔ اور اس سے پہلے کہ حمدو کچھ جواب دیتا اس نے حمدو کے منہ میں اپنے ہی ہاتھ سے چاکلیٹ ٹھونس دیا اور جب چاکلیٹ منہ میں دبا کر حمدو نے جست لگائی تو وہ ظاہر میاں کی کبڑی بیوی کے تہہ خانے کے سامنے تھا۔

حمیدہ بانو دیکھتے دیکھتے پھر مالکن بن بیٹھی تھی۔ دوسری کرایہ دار عورتیں اس کی چاپلوسی کرتی اس کے اطراف جمع تھیں۔ وہ بالکل بھولی ہوئی تھی کہ مستنڈے مولوی کی آغوش میں ہوتی ہے تو سب کچھ جان کر بھی اس کے کرایہ دار ایک لفظ اسے نہیں کہتے۔ معشوق علی سے جب سب کچھ دیکھا نہ گیا تو اس نے گھر چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی لیکن کرایہ داروں نے معشوق علی کے جاتے ہی حمیدہ بانو کو اس کی جگہ مختارِ کل مان لینے میں دیر نہ کی۔

حمیدہ بانو کہہ رہی تھی "روپ متی کے پاس روپ کا جادو ہے چاچی۔ مولوی صاحب کہتے تھے۔ سو سو نخروں سے رجھایا اس نے میونسپلٹی کے افسر کو۔ اٹھایا ہوا سامان رکھوایا گیا ہے وہ۔ اب ہے کیا گل کھلائے گی یہ روپ متی"۔

چاچی جو حاجی اسد اللہ کی بیوی تھی اس طرح آنکھیں پھاڑ کر یہ سب کچھ سن رہی تھی جیسے اپنے وسوسوں اور شکوک کی تصدیق ہونے پر اسے اچنبہ کم، دکھ زیادہ ہو رہا ہو۔

حاجی سید اسد اللہ ادھیڑ عمر کا کبڑا آدمی تھا۔ بیڑی اس شان سے پیتا تھا جیسے سگار پی رہا ہو۔ صبح آنکھ کھلتی تو رات بستر پر جانے تک اسے آسمان دیکھنے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اونچا بھی سنتا تھا۔ چلتا ہوا ایسا لگتا تھا جیسے راستے پر کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ لیکن تھا بڑا دلچسپ آدمی، باتیں بڑے مزے کی کرتا۔ عورتیں بغیر کسی تکلف کے اسے گھیر لیتیں اور وہ انھیں خوب ہنساتا لیکن چاچی سمجھتی تھی کہ زمانے بھر کی عورتیں کبڑے حاجی پر فریفتہ ہیں۔

کبھی کبھی وہ روپ متی کے گھر بھی چلا جاتا - روپ متی اس کی بڑی مدارات کرتی اور وہ ان سب کو ہنساتا - ایک دن جب چاچی نے روپ متی کو اس کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے سن لیا تو حاجی اسد اللہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاچی نے بات کو اتنا بڑھایا کہ اپنا بوریا بستر اسمیٹ کر کسی رشتہ دار کے پاس نکل کھڑی ہوئی تھی - احاطے بھر میں جب سبھوں کو چاچی کی خفگی اور ہجرت کی وجہ معلوم ہوئی تو ہنس ہنس کر لوگوں کا برا حال ہو گیا -

حاجی اسد اللہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مردوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے کہا تھا۔

"یہ جو ظاہر میاں کی بیوی ہے نا اس سے میرے رومانس کی بات چلتی تو پھر کچھ بات بھی تھی سبھوں نے ظاہر میاں کی بیوی کی طرف دیکھا - یہاں تک کہ خود ظاہر میاں نے بھی اور سب ہنس پڑے تھے -

آج جب چاچی کو حمیدہ بانو نے روپ متی کے غمزوں اور نخروں کی بات مولوی صاحب کے حوالے سے سنائی تو چاچی کے سوئے ہوئے وسوسے پھر سے جاگ اٹھے -

اس نے ٹھنک کر کہا ——— "اے ان غمزوں کو تو کوئی حاجی اسد کے دل سے پوچھے"

شکرانے کی نماز ادا کر دو چچی، جو اگر یہ جادو تمہارے میاں پر چل جاتا تو ——— حمیدہ بانو نے کہا -

"ہاں بی بی وہ تو کروں گی ہی ——— اچھا ہی ہے - چاچی نے - کچھ

سوچ کر کہا ــــــــــ کسی ایک سے لگا رہے نا یہ نتنہ تو احاطے بھر کے مرد محفوظ رہیں گے ۔ شکرانے کی نماز تو ہم سب کو ملکر ادا کرنی چاہیئے ۔

سر شام انسپکٹر روپ متی سے ملنے کے لئے پھر آیا تو اس نے اندر رہ کر بھی ملنے سے انکار کر دیا ۔ کہلا بھیجا بیمار ہے نہیں مل سکتی اور یہ بھی کہ قرقی کی رقم بن پڑے گا تو وہ خود ادا کرے گی ورنہ جو بھی ہو گا اسے نبٹ لے گی ۔

دن بھر پڑوسنوں اور احاطے کے مردوں کی باتیں سن سن کر اس کے کان پک گئے تھے ۔ دن بھر وہ روتی رہی تھی ۔

انسپکٹر جا چکا تو مستنڈا مولوی اور حاجی اسد اللہ دل ہی دل میں خوش تھے کہ انہیں روپ متی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کا جیسے قانونی حق پھر سے مل گیا ہے جو چھینا جا رہا تھا ۔

عورتیں اب ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں " صاف مچل دے گئی ہے روپ متی انسپکٹر کو وہ بھلا کسی ایک کی ہو کر رہ سکے گی ؟

میں
بھی
فسانہ
تم
بھی
کہانی

**تمہاری** آنکھیں تو وہ آئینہ تھیں جن میں جھانک کر میں اپنے خدوخال ہی نہیں اپنی روح کا عکس بھی دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب یہ آئینہ خانہ ایک ایسا حیرت کدہ بن گیا ہے جس میں جھانکتا ہوں تو اپنی صورت تک پہچانی نہیں جاتی۔ ہم کبھی اتنے اجنبی تو نہ تھے اس وقت بھی نہیں جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا —— جنم جنم کا ساتھ دینے کی قسمیں کھانے والے ہم لوگ اپنی محبتوں کو زندگی کے دکھ درد سے بچا کر اور کتنی دور لے جا سکتے ہیں۔ اب تو ہمیں اس کی بھی خبر نہیں —— اور پھر سچ پوچھو تو ہمارے پاس اس کے سوا تھا بھی کیا —— لیکن کیا تم آج بھی مجھے چاہتی ہو؟ —— کیا میرے لئے آج بھی تم میں وہی دلکشی ہے؟ —— اگر ہے تو پھر یہ دوری کیا ہے —— ایسا کیوں ہے کہ وہ جو تم ہو، تم نہیں ہو —— وہ جو میں ہوں، میں نہیں ہوں۔

ہم سر جھکائے ایک ہی ڈگر پر اس طرح چل رہے ہیں جیسے منہ اٹھائے
مخالف راستوں پر چل رہے ہوں ــــ میں جو باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں ان کا تعلق
نہ گھر کے کرائے سے ہے جس کا تقاضہ ہم پر ہو رہا ہے، نہ گوالن کی تنک مزاجی سے کہ
اس نے کل سے ننھے کا دودھ بند کر دینے کی دھمکی دی ہے۔

ــــ میں تو تم سے جسم و جان کی باتیں کر رہا ہوں ــــ منہ بند سیپ میں
چھپے ہوئے اس سچے موتی کی باتیں کر رہا ہوں جو تم نے اپنے سینے سے میرے سینے میں
منتقل کیا تھا۔ روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی التجاؤں اور دعاؤں کی باتیں کر رہا ہوں
ــــ ایسی باتیں کر رہا ہوں جنھیں ہم بھولتے جا رہے ہیں ــــ تمہیں یاد ہے
ــــ کبھی تم نے مجھے لکھا تھا کیا لکھا تھا تم نے مجھے بھی تو پوری طرح یاد نہیں
ــــ شاید تم نے معصومیت سے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میں دفتر سے تھکا ہارا
گھر لوٹوں گا تو تم مجھے آرام کرسی پر گرا دو گی ــــ بڑے چاؤ سے میرے جوتے کی
ڈوریاں کھولو گی ــــ میرے کوٹ کے بٹن کھولو گی ــــ ان مخروطی حنائی
انگلیوں سے جن سے میری زندگی کی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں، تم نے جوتے کی ڈوریاں
اور کوٹ کے بٹن کھولنے کا پیمان کیا تھا ــــ تم نے تو پھر اسی زمین پر رہ کر بات
کی تھی، شاید اسی لئے کہ عورت ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو اپنے
پیروں کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتی ــــ لیکن میں تو زمین کی پستیوں سے اتنا
بلند ہو گیا تھا کہ ستارے میری نظر میں سنگریزوں کی طرح ماند پڑ گئے تھے، شفق کی
سرخیاں دلِ پرخوں کا عکس بن گئی تھیں جو آنکھوں میں اتر اتر کر آنسو بن جاتی تھیں۔
لیکن ہاتھ نہ سنگریزے ہی آئے تھے نہ آنسو ــــ اور نہ میں چلتے پھرتے افسانوں

کے جنگل میں تمہارے نرم و نازک وجود سے شفتگی کا گراں بار بوجھ اٹھائے تنہا تنہا دبا جا رہا تھا، لیکن اس واماندگی کے باوجود مجھ میں دنیا بھر پر چھا جانے کا حوصلہ تھا۔

اسی حوصلہ کے سہارے جب میں نے ہاتھ پکڑ کر تمہیں زمین سے اوپر اٹھالیا تو ہماری محبت زندگی کا بوجھ سہار نہ سکی اور ہم زمین پر لوٹ آئے ——— یہ واپسی تو مبارک اور مسعود تھی ہم چاہتے بھی تو یہی تھے تاکہ چمن کا پھول بن کر مہکیں۔ صبا کی رفتار بن کر چلیں۔ اوس کے موتی بن کر سورج کی کرنوں میں زندگی کو گم کر دیں۔ لیکن میرے کوٹ کے بٹن سرے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تمہیں فرصت یک نگاہ بھی کہاں تھی۔ ہم نے کب سوچا تھا کہ یہ دھرتی جس پر ہم ساتھ ساتھ قدم اٹھانے کے لئے لوٹ آئے ہیں یوں بھی ہو گا کہ ہمارے پیروں تلے سے سرک جائے گی۔

اب یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے۔ جب میں دفتر سے گھر لوٹتا ہوں تو ہم ایک دوسرے کو کیسے اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں۔ جیسے جانتے تو ہوں لیکن پہچان نہیں پا رہے ہوں ——— ابھی کل ہی کی تو بات ہے ——— میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سارے گھر کی صفائی کے بعد چہرے اور بالوں پر اَٹے ہوئے گرد و غبار کو ابٹن اور غازہ سمجھ کر اس طرح مطمئن ہو جاتی ہو کہ مجھے تمہارے چہرے کی یہ بیوگی اچھی نہیں لگتی ——— اس بات کی تلخی شاید تمہیں کھل گئی تھی۔ تم نے دوسرے دن بناؤ سنگھار کیا——— اور جب میں گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں اجالے اجالے سے نظر آئے ——— لیکن تم بہت جلد بھول بھال گئیں کہ میرے لئے تمہیں یہ اہتمام زندگی بھر کرنا ہے خواہ گھر کا سارا بوجھ سمیٹتے سمیٹتے تمہارے ہاتھ شل کیوں نہ ہو گئے ہوں۔

پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا ہوں کہ چلو، تم نے ٹھیک ہی کیا ورنہ کہیں اس اجالے کا تصور بھی مٹ جاتا تو ——— کیونکہ تمہارے کنوارے الھڑپن کو سہاگ کی سپردگی عطا کرنا تو میرے بس میں تھا لیکن تم سے اس سہاگن بیوی کو چھین لینا خود میرے بس میں کہاں ہے ۔ جی چاہتا ہے، اس سے پہلے کہ تم اس معاشرہ کے ہاتھوں ایک جیتی پھرتی کہانی بن جاؤ اور میں ایک جیتا جاگتا افسانہ تم سے جی بھر کے محبت کی باتیں کر لوں ——— ایسی باتیں جن کا اسکول کی فیس نہ دے سکنے کے باعث نوڈ کے امتحان میں عدم شرکت سے کوئی تعلق نہیں ہے ——— نہ ہی ان باتوں کا تعلق تمہارے ان ننگے ہاتھوں سے ہے جن میں چوڑیاں نہیں بجتیں نہ سونے گلے سے جس میں کالی پوت کا لچھا تم کبھی ضروری سمجھتی تھیں ——— ہم شاید زندگی کی ان معاملات سے بہت آگے نکل آئے ہیں، کیوں کہ ہم لوگ پڑھے لکھے لوگ ہیں، سمجھ دار لوگ ہیں، میں تم سے ان چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں جن کو کبھی تم نے اور کبھی میں نے قتل کر دیا ہے ——— مجھے تو تم سے محبت کی باتیں کرنی ہیں۔ ——— تم سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا ہمیں اپنے سن و سال کی ساری پونجی کھو کر ایک دوسرے کو سمجھے بغیر ہی اس دنیا سے گذر جانا ہے ؟

مجھے تو تم سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس دن، جس دن تم اپنے دور افتادہ بھائی کو کوسنے دے رہی تھیں کہ اس نے تمہاری زندگی تباہ کر دی اس لئے کہ وہ تمہاری اور میری محبت کو پروان چڑھانے میں ایک وسیلہ رہا تھا، مجھے بتاؤ کیا تم یہ سچ کہہ رہی تھیں ؟ اگر یہ سچ ہے تو اتنا بھیانک سچ تمہیں کہنا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ سچائی اگر موت کی طرح سفاک ہو تو زندگی کے خوبصورت جھوٹ میں

اُسے چھپالینا چاہیئے ۔

ہم انسان ہیں لے کر تو کچھ آئے نہیں تھے نہ کچھ لے کر جائیں گے ہی لیکن ایک دوسرے کو کچھ دینے لینے میں کیوں بخل سے کام لیں ۔

اسی لئے تو میں تم سے آج صرف محبت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں ۔ فی الوقت تم بھی اس حقیقت کو بھول جاؤ میں بھی اس حقیقت سے آنکھیں چرالوں کہ ہم اپنی محبت کی باتیں ختم کر لیں تو مجھے دانے دانے کی تلاش میں سرگرداں ہو جانا ہے اور تمہیں ننھوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر روٹیاں بیلنی ہیں اور انھیں جھوٹی سچی کہانیاں سنانی ہیں کہ پرستان کا شہزادہ ٹھنڈے میٹھے پانی کو دودھ سمجھ کر پی جاتا تھا ۔

مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا تھا کہ نہ تم کو مجھ سے نفرت ہے نہ مجھے تم سے ۔ بات اتنی سی ہے کہ تم میری چپ کو پہچان لو میں تمہارے آنسوؤں کا راز جان لوں ۔ ہم ایسی کٹھ پتلیاں ہیں کہ جن کی ریشمی ڈوریاں ہمارے معاشرے نے اپنی انگلیوں پر لپیٹ رکھی ہیں لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ان کٹھ پتلیوں کا ذہن ہے جذبہ ہے احساس ہے اور جب تک یہ سب کچھ رہے گا نہ ہم مل جل کر خوش رہ سکیں گے نہ بچھڑ کر زندہ، اس وقت تک جب تک کہ یہ ریشمی ڈوریاں کٹ نہیں جاتیں ۔

میری چپ سے تمہارے آنسوؤں تک جو راستہ جاتا ہے ۔ وہ ایک ایسا پل صراط ہے کہ ہم پار اتر لیں تو پھر کوئی پرستش نہیں ہوگی ۔ اس لئے کہ تلوار کی دھار پر چلنا خشک آنسوؤں کے نیزے کی انی کو دل میں اتار کر لینے

سے زیادہ مشکل نہیں ہے ۔

جی چاہتا ہے کہ تمہارا ہاتھ تھامے ماضی کے ایک ایک چمن زار میں گھوم پھر لوں کچی کلیاں پھر سے تمہارے راستے میں بچھاؤں اور جب تم انھیں روندکر گذر جاؤ تو میں چن کر اپنے دامن میں محفوظ کر لوں کہ ان پر تمہارے نقشِ کفِ پا ہیں ۔ اور اگر ایسے میں اپنی موٹر سائیکل پھٹ پھٹاتا غلّے والا سیٹھیا اس چمن زار میں در آئے اور میرا راستہ روک لے تو تم کچھ پروا کرو نہ میں کچھ بُرا مانوں کہ اس عزت و توقیر کی میّت کے اٹھ جانے سے ہماری محبت کو کیا لینا دینا ہے ۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم لوگ کیسے پاگل سے لوگ ہیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں مانگتے صرف اتنا حسنِ سلوک مانگتے ہیں کہ ہمارے بعد زندگی پر یہ حرف نہ آئے کہ اس نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا ۔

تمہیں یاد ہے کہ ایک سہانی شام کو ہم اپنی اداسیاں سمیٹے چل پڑے تھے کہ شاید کہیں بہل جائیں ۔ تم اس کوشش میں تھیں کہ مجھے خوش نظر آؤ میں تمہیں یہ جتلانا چاہتا تھا کہ واقعی شام کتنی ــــــ خوب صورت ہے کیونکہ مجھے ایک کہانی کا بہتر معاوضہ ملا تھا ۔ جب ہم بستی چھوڑ کر اتفاقاً اس باغ کے قریب آ گئے جہاں ہماری محبت کی ابتداء ہوئی تھی تو میں نے گفتگو کا موضوع بدل دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت تم مجھ سے اس قرض کی بات چیت کا آغاز کر چکی تھیں ۔ جو مجھ سے میری انا چھین رہا تھا اور تم سے تمہارا حُسن میں نے تم سے کہا تھا ــــ ہٹاؤ بھی ــــ دیکھو شفق کیسی پھول رہی ہے ۔ اور وہ حدِ نظر پر کون کس سے مل رہا ہے ۔ کیا وہ بھی ہم ہی تو نہیں ؟ لیکن کوئی چور تھا جو اس وقت بھی میرے دل میں گھسا میری محبت کی

نگری لوٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم سم اس باغ میں داخل ہو گئے تھے جس کے پھول مرجھا چکے تھے جس کے گملے ٹوٹ گئے تھے جس کی کیاریاں اجڑ گئیں تھیں جس کی روشیں خاردار جھاڑیوں میں الجھ چکی تھیں اور وہ مکان جس کے محراب میں دیا جلا کر تم مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرتی تھیں کیسا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنا وجود بھی تو بالکل اسی مکان کی طرح لگا جیسے ایک کھنڈر کے مقابل کھڑا ہوا اور تم حیران حیران نظروں سے دونوں کو تک رہی تھیں۔

یہ کیسا دکھ درد ہے کہ ہم ہجر کی لمبی راتوں کا کرب آج وصال کے لمحے لمحے میں محسوس کرتے ہیں۔ تم نے تو یہ سوچ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میرا ہاتھ تھام لو گی تو میں خود کو فاتح مکان و زماں سمجھنے لگوں گا۔ اور میں نے یہی کچھ سمجھا بھی۔

لیکن اگر تمہارے ہاتھ جن میں پھولوں کی کوملتا تھی۔ اب اتنے کھردرے ہو گئے ہیں کہ میرے اپنے ہاتھوں کی بے حسی اس لمس کے فرق کو بھی محسوس نہیں کر سکتی ہے تو بتاؤ میں کہاں قصور وار ہوں، تمہارا کہاں دوش ہے۔ محبت تو انسانی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمہاری عرق عرق پشیمانی سے اگر محبت مرجھا جاتی ہے۔ میرے ذہن کی تابانی سے اگر سینے میں اندھیرے سے جنم لیتے ہیں تو نہ تم محبت کو بددعا دو نہ میں اپنے شعور کے اجالوں کو قتل کر دوں۔ بعض اوقات کبھی چھوٹی چھوٹی مصلحتیں زندگی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی کی چغلی کھاتی ہیں۔ ہم اپنے مجروح احساسات کو چھپا لینا چاہتے ہیں تو مسکراہٹ میں بھی یہ جراحتیں بکھر جاتی ہیں، اور یہ تبسم کیسا زخمی دکھائی دیتا ہے۔

میں نے تمہاری خوشی کو اپنی خوشی اور تمہارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے

کی جو باتیں کی تھیں کیا میں وہ سب بھول گیا ہوں؟ —— پنجرے سمیت اڑ جانے کی سوچنے والا میں؟ پر کٹے پرندے کی طرح زمین ناپ رہا ہوں۔

بس ایک جینے کی ڈگر سی پڑ گئی ہے جس کو میں عادت کا نام دے کر اپنی شکست خوردگی کے احساس کو نرم کر لیتا ہوں۔ اور تم مصلحتاً اسی کو میری محبت سمجھ لیتی ہو۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ جس دن چھپ کر اپنے گھر آیا تھا۔ میں نے پہلی کاپی تم کو نذر کی تھی۔ میں کتنا مطمئن مطمئن سا تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر بستا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن تمہارے دل میں دور دور تک ممتا کی کوئی کرن نہیں تھی۔ تم نے مسکرا کر یہ کتاب قبول کر لی۔ میں نے اس مسکان میں زخموں کا ایک چمن دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ہم نے اپنا آبائی گھر بیچ دیا تھا۔ ناقابلِ برداشت قرض کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا وہ اس کتاب میں لگ گیا تھا۔ تم تو ماں ہو تم نے یہی سوچا ہو گا کہ کہانیوں نے گھر بنا لیا پر حقیقتوں کا گھر نیلام ہو چکا ہے۔ تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ میں نے تمہیں چھیڑنے کے لئے کہا تھا —— اپنی کہانیاں مجھے بڑی پیاری ہیں کیوں کہ میں نے انھیں جنم دیا ہے۔ وہ میری معنوی اولاد ہیں۔ لیکن ان سے تمہارا سلوک سوتیلی ماؤں کا سا کیوں ہے؟ تم مسکراتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ پھر آبدیدہ ہو گئیں اور تمہارے آنسو میرے پہلے مجموعے کی پہلی کاپی پر گر پڑے جو تمہارے ہاتھوں میں تمہاری نظروں کے سامنے کھلا ہوا تھا اور میں نے تمہارے ہاتھ سے اپنی یہ کتاب واپس لے کر بڑے جتن سے بک شیلف میں سجا دی کہ اس میں میرا خونِ جگر بھی شامل

ہے تمہارے آنسو بھی۔

تم ہی بتاؤ کہ اپنی محبت میں اس بات سے تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے کہ میں ایک عظیم زبان کا ادیب ہوں جس کی موت کے بعد مستقبل کو اس کی تحریر کا ایک حرف ہی ملتا ہے اور اس کی قبر کا نشان۔ لیکن اپنی نسل کے بہت سے دیوانوں میں اگر میں بھی شامل ہوں اور ہم اپنے اپنے خون سے دیئے جلائے ایک دوسرے ہی کو راستہ سجھانے چلے ہیں تو کیا تمہیں اس دیوانگی پر پیار نہیں آتا جو مستقبل سے آس لگائے بغیر ہی اپنے حال میں مست ہے۔

# گنجا مسیح

اُس کو جدا ہوئے تین برس بیت گئے ہیں ــــ آج اس کی تیسری برسی ہے۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

میں جانتا ہوں گنجا مسیح الدین اس کا دیوانہ رہا ہے ــــ مسیح الدین میرا گہرا دوست ہے ــــ وہ گنجا ہے ــــ میں محبت سے اس کو چھیڑنے کے لئے گنجا مسیح پکارتا ہوں ــــ اس بے تکلفی کے لئے آپ مجھے معاف کر دیں ــــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ گنجا مسیح اپنے مرحوم بیٹے کا دیوانہ رہا ہے۔ میں نے باپ بیٹے بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسے باپ بیٹے نہیں دیکھے ــــ گنجے مسیح کی اپنے بیٹے سے محبت کچھ دیوانگی کی حد تک تھی ــــ مجھے تو کئی بار گنجے مسیح پر شبہ ہوا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ــــ اب آپ ہی بتائیے کہ راستے سے گذر رہے ہوں اور اسکول سے لوٹتے بچوں کے غول میں اگر اس کو اپنا تیرہ سالہ تیمور نظر نہ آتا تو اس کی بے قراری کا عالم دیدنی

ہوتا وہ کچھ نہ کچھ بہانہ تراش کے گھر لوٹتا جو اسکول سے قریب ہی تھا ــــ اور فیرو کو دیکھ آتا۔ اس سے مل کر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔

"بھئی تم نظر نہیں آئے ــــ کس راستے سے آئے ہو۔ کب آئے ہو۔ اچھے ہونا"

میں گنجے مسیح کو ستانے کے لئے اضافہ کرتا۔

"کیوں آئے ہو، نام کیا ہے۔ مجھے پہچانتے ہو نا میں کون ہوں" ــــ

اور وہ دونوں ہنس پڑتے، پھر فیرو کی فرمائشیں شروع ہوتیں ــــ پتنگ، چار قسم کے مانجے، پانچ کپیاں یعنی دھاگے کی کنگھیاں۔ مانجے میں گندھک کے مانجے کے لئے بطور خاص ہدایت کی جاتی۔

اس سے اس طرح ملاقات کے بعد گنجا مسیح نارمل آدمی بن جاتا۔ ایسے میں اس کو دیکھ کر لگتا کہ دنیا بھر کا سکون، دنیا بھر کی راحتیں اسی ایک آدمی کے حصے میں آ گئی ہیں ــــ جیب اجازت دیتی تو فیرو کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں جو خوشی اسے محسوس ہوتی وہ شاید اس کی ایسی خوشی ہوتی تھی جسے ہم وقت کا حاصل کہہ سکتے ہیں ــــ اور اگر وہ ان چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو پورا نہ کر سکتا تو اس کے ذہنی کرب کا عالم بھی احساسات کیلئے ایک تازیانہ ہوتا۔

گنجے مسیح کی اس دیوانگی کی داستانیں بڑی طویل ہیں۔ کوئی وجود کسی وجود کے لئے آنکھوں کی بینائی بن جائے، قوتِ سماعت بن جائے، نفس کی آمد و شد بن جائے۔ احساس و شعور نہیں بلکہ خود ذہن بن جائے تو ایک دوسرے سے جدائی بہتر ہے ــــ تاکہ کسی ایک وجود کی تکمیل ہو سکے۔

شاید کچھ یہی سوچ کر تیرہ سالہ دوستی کے بعد فیرو نے گنجے مسیح کو تنہا چھوڑ دیا ـــــ میں تو بس حیران رہ گیا۔ یہ گنجا مسیح آخر زندہ کس طرح ہے۔ مر کیوں نہیں گیا ـــــ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کی زندگی بے مقصد ہے۔

مجھے یاد ہے ـــــ جب فیرو اس دنیا کو چھوڑ رہا تھا تو گنجے مسیح کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ نکلی ـــــ وہ اضطراب، وہ بے قراری جو اسکول کی راہ میں فیرو کو نہ پا کر اس پر طاری ہو جاتی تھی آج تو اس کا تک کہیں پتہ نہ تھا ـــــ بس ایک چپ تھی اور وہ تھا۔

جب فیرو کی ماں، دادا، دادی اور دوسرے رشتہ دار بین کر کے اور چلا کر رونے لگے تو وہ بے کل ہو اٹھا ـــــ انگلی ہونٹوں تک لا کر اس نے شو شو کی آوازیں نکالیں اور سب کو منع کرتے ہوئے بولا ـــــ

"چیخو نہیں وہ گھبرا جائے گا"

میں سمجھ گیا کہ گنجا مسیح اب گیا ہاتھوں سے۔ وہ تو اب بھی اپنے فیرو کی زندگی کو منوانے پر مصر ہے۔

اس کی چپ کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے ـــــ کسی نے اس کی بیوی سے کہا اس کو رلاؤ۔ بیوی بیچاری خود اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی ـــــ وہ اٹھی ـــــ اس نے کہنے سننے پر عمل کر کے گنجے مسیح کو تھپڑ لگائے ـــــ "تم رو دو ـــــ روتے کیوں نہیں ہو" ـــــ وہ خود دھاڑ و رو کر چیخ رہی تھی ـــــ لیکن گنجے مسیح نے صرف اتنا کہا ـــــ

"میں اچھا ہوں، بالکل ٹھیک ہوں"۔

پھر وہ اُٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے اپنے فیروز کی پتنگ اونچی الماری پر چھپا رکھے تھے۔ اس نے ایک پتنگ نکال کر آنکھوں سے لگا لیا اور چاہا کہ اس کے سہارے رُو پڑے۔ لیکن وہ رُو نہ سکا۔ پتنگ کا کچا رنگ اس کی آنکھوں اور گالوں پر اُبھر آیا لیکن آنسو دور دور تک نہیں تھے شاید اس لئے کہ آنسو اس بات کا اعتراف تھے کہ فیروز زندہ نہیں ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا گنجے میسح کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔

پھر وہ چپکے سے اس کمرے سے نکل آیا اور اپنے فیروز کے پاس جاکر چپ چاپ بیٹھ رہا جو گہری نیند سو رہا تھا جس کو میسح موت ماں لینے کے لئے تیار نہ تھا۔

دن گذرتے گئے —— اور اپنی چپ کے سہارے گنجا میسح زندگی کی ہماہمی کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے لگا۔ لیکن اس کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود کی دھجیاں بکھر گئی ہیں —— اس کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ وہ راتوں کو نیند میں سسک سسک کر روتا ہے۔

آہستہ آہستہ وقت کا مرہم اس کے زخموں کو مندمل کرنے لگا تو اس نے بھی یادوں کی ایک انجمن سجا لی —— ایک دن وہ ایک خوبصورت سا شوکیس بنا لایا۔ اپنی کتابوں کے شلف کے برابر رکھ کر اس نے اپنے فیروز کی ایک ایک نشانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی اور شوکیس میں اس احتیاط سے رکھتا گیا جیسے ہرے ہرے زخموں پر سے پٹی اتار رہا ہو۔ اس کی پنسل اس کی نوٹ بکس اس کی کتابیں اس کی کارچ اور کانسے کی گولیاں، اس کے پتنگ دھاگے کی گنگھیاں، چرخی اس کے کپڑے

اس کے شوز، اس کی تصویریں غرض کہ اس کی ایک ایک چیز گنجے مسیح نے اس شوکیس میں سجادی۔

اب ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ کرنے دیکھنے میں ..... اس کی نوٹ بکس کھول کر اس کی تحریریں پڑھنے میں اس کی تصویریں دیکھنے میں اسے جو سکون ملتا تھا اس کی لذت سے تو وہی واقف ہوگا ـــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گنجا مسیح اپنے زخموں کی کھیتی ہری کر رہا ہے اور یہ عمل وہ دانستہ کرتا ہے تاکہ چیزوں پر جمع ہوئی گرد کے ساتھ ساتھ یادوں پر جمی ہوئی وقت کی دھول بھی صاف ہو جائے۔

ایک دن وہ اپنے فیروز کی قبر کی تصویر اتار لایا اور اس کی فریم میں لگی ہوئی تصویر کے برابر دوسرے فریم میں جڑ کر اس نے اس کو شوکیس میں رکھ دیا۔

ہر سال فیروز کی قبر پر جو چادر گل چڑھائی جاتی تھی گنجا مسیح برسی کے چوتھے پانچویں دن سوکھے ہوئے پھولوں کو قبر پر سے اٹھا لاتا اور اپنے کپڑوں کے بکس میں احتیاط سے رکھ چھوڑتا ـــــ لیکن وقتاً فوقتاً کپڑے نکالنے اور دیکھنے میں جب سوکھے پھول چادر کے تاگوں سے الگ ہونے لگے تو اس نے انھیں بھی احتیاط سے شوکیس میں منتقل کر دیا ـــــ لیکن اس کے کپڑوں کے تانے بانے میں بسی ہوئی سوکھے پھولوں کی خوشبو سے جب وہ اسطرح محروم ہوگیا تو کچھ دنوں تک وہ پھر اداس اداس رہا۔

ایک دن اس کے دوسرے بچے نندو نے کھیلنے کے لئے کانچ اور کانسے کی چند گولیاں شوکیس سے نکال لیں ـــــ گنجے مسیح نے جب دیکھا تو وہ بہت بگڑا ـــــ ساری گولیاں نندو سے چھین، اس کو ڈانٹ پلائی اور گولیاں پھر سے شوکیس

میں محفوظ کر دیں۔

اس کے بعد پھر کسی نے شوکیس کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ کی ——— آنے جانے والوں میں کوئی فیرو کی تصویروں کا البم اس کی عدم موجودگی میں دیکھتا تو نہایت احتیاط سے وہیں رکھ دیتا جہاں سے اٹھایا تھا۔

آج صبح ہی سے گھر کا ماحول کچھ اداس سا تھا۔ بچے باہر کھیل رہے تھے لیکن اس کی بیوی اور وہ آپس میں کچھ کہے سنے بغیر اپنے اپنے دلوں میں کوئی نشتر چھپائے ہوئے خاموش تھے۔

فیرو کو جدا ہوئے تین برس بیت گئے تھے۔ آج اس کی تیسری برسی تھی۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

گنجے مسیح کی چھٹی لوٹ آئی تھی۔ اپنے فیرو کے سامان کو جھاڑ پونچھ کر صاف کرنے کے لئے اس نے شوکیس کھولا تو فیرو کا کوٹ اور جوتا غائب تھا ——— وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اپنی بیوی کو پکار کر اس نے پوچھا۔

بیوی نے بھیگی پلکیں اٹھا کر کہا ——— میں نے ندو کو پہنا دیا ہے۔ اس کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے اور جوتا پھٹ گیا ہے ——— آپ آج فیرو کی قبر پر جاتے ہوئے ندو کو اس کے اسکول پر چھوڑ دیجئے۔

ماں کے پیچھے سے نکل کر ندو نے گنجے مسیح کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ لباس اس پر سج رہا تھا۔

کچھ جواب دیئے بغیر ندو کا ہاتھ تھام کر جب گنجا مسیح گھر سے باہر نکل گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ایک ہاتھ کے سہارے کندھے

پر ایک جنازہ اٹھا رکھا ہے اور اس کا دوسرا ہاتھ تھامے زندگی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں ــــــــــ

موت اور زندگی کی اس کشاکش میں

گنجے مسیح اور یسوع مسیح میں کیا فرق ہے ؟

میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا !

# جھوٹی سچائی

دوراہے پر پہنچ کر اس کا جی چاہا سیدھے راستے پر چل پڑے اس کے باوجود بھی کہ وہ طویل تھا لیکن اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ بزدل ـــــ موت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے جس کا آنا یقینی ہے اور جس وقت اس کو آنا ہے وہ آکر رہے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس کو ٹالا بھی جا سکتا ہے۔ وہ چند ے توقف بھی کر سکتی ہے۔ انسان کے بس میں کیا نہیں ہے۔

لیکن اس کا سائیکل سیدھے راستے پر دور تک نکل گیا ـــــ

اس نے سوچا اب بھی واپس لوٹ کر پھر اس راستے پر چل پڑے جو اس کی منزل کو قریب تر کر دیتا تھا ـــــ لیکن اس کے ذہن میں ایک اور منطقی استدلال اُبھر آیا ـــــ اور وہ سوچنے لگا کہ اس طرح واپس لوٹنا بھی اس بات کی دلیل

ہے کہ اس خیال کو اہمیت دے رہا ہوں جو میرے دل و دماغ پر آہستہ آہستہ حاوی ہوتا جا رہا ہے۔

"اب جبکہ یہاں تک چلے آئے ہیں تو چلو یہی راستہ سہی۔

واپسی میں تو اُدھر سے آ سکتے ہو۔

دل نے جیسے چوری پکڑ لی۔

اس نے خوف کی پرچھائیوں کو پیچھے چھوڑنے کے لئے رفتار پر سائیکل تیز کر دی اور ہواؤں میں تتلی کی طرح اُڑنے لگا۔ اس طرح خود اپنے آپ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ ترنگ میں ہے اور کوئی خوف اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے۔

واپسی میں ــــ یقیناً ادھر ہی سے آؤں گا۔ اس نے دل ہی دل میں اس طرح طے کیا جیسے عزم کر رہا ہو ــــ اور سیٹی بجا کر سائیکل پر ہواؤں میں اُڑتے ہوئے اس نے خود کو زندگی کی گود میں ہمکتا ہوا محسوس کیا۔

دفتر سے واپسی پر جب اس کا سائیکل اس کمان کے پاس پہنچ گیا جس میں داخل ہو جانے سے وہ راستہ شروع ہو جاتا تھا جس پر سے ہو کر گذرنے سے اس کا گھر نسبتاً بہت قریب پڑتا تھا تو بادلِ نخواستہ وہ اس راستے پر مڑ گیا۔

کاش مجھے یاد نہ آتا کہ میں نے اس راستے سے واپسی کا عزم کیا ہے ــــ یہ خواہش اس کے دل میں تھی لیکن وہ اس خواہش کو مان لینے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک خوف سا اس کے دل و دماغ کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لیتا جا رہا تھا جس کے آگے سپر ڈال دینا اسے گوارا نہ تھا۔ اگر وہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا تو پھر یہ راستہ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے

بند ہو جاتا۔

اس کی نظر میں راستے کے مسدود ہو جانے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔
فرض کیجئے کہ بیچ راستے پر حکومت کوئی بلڈنگ کھڑی کر دینا چاہے
اور اسطرح یہ راستہ بالکل بند ہو جائے جو اس کے گھر اور دفتر کے درمیان خطِ مستقیم
بنا ہوا تھا تو اس کو حکومت پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

کوئی باغی کسان سمنٹ روڈ اکھیڑ کر اس پر ہل چلا دے اور اس طرح بیچ
سڑک پر کھیتی لہلہانے لگے تو بھی اس کو کوئی اعتراض نہ تھا۔
سچ پوچھئے تو ایسی کوئی تبدیلی اس کے لئے ایک چھپی ہوئی مسرت کا باعث
تھی جس کو وہ علی الاعلان مان لینے کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔

جب اس کا سائیکل قبرستان کے روبرو سنگ تراش کی دوکان کے
برابر پہنچ گیا تو اس نے سوچا میں سنگ تراش کی دوکان کی جانب نگاہ کئے بغیر ہی کیوں نہ گذر
جاؤں ـــــ پھر خود ہی اس نے اس خیال کی تردید کی کہ یوں چوروں کی طرح نظر اٹھائے
بغیر گذر جانا کسی خوف کی نشاندہی کرتا ہے جسے میں جھٹلا رہا ہوں۔

اس کے ذہن میں ایک جھنجھلاہٹ سی آ گئی ـــــ اتنا سارا راستہ میں
نے یہ سوچے بغیر کہ میرے جوانب میں کیا ہے طے کر دیا۔ اِدھر اُدھر نظر اٹھائی
بھی تو کوئی شئے نظروں میں کھب کر تو نہیں رہ گئی اور نہ یوں ہوا کہ کسی خوف
سے نظریں جھکی جھکی رہ گئی ہوں ـــــ لیکن سنگ تراش کی اس دوکان سے
گذرتے وقت آخر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ آج کتنے دن سے میں اس خیال
سے لڑ رہا ہوں کہ واہمہ زندگی کو گھُن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کتنی ہی بار گھر سے

چلتے وقت میں نے طے کیا ہے کہ آج سنگ تراش کی اس دوکان سے اسطرح گذر جاؤں گا جیسے مسافر راستے سے گذر جاتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس خیال نے جھنجھوڑ دیا کہ سنگ تراش کی دوکان سے گذرنے کے لئے قبل از قبل ذہن کو ہموار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسافر اس راستے سے اسطرح تو نہیں گذرتے بس گذر جاتے ہیں ـــــ یہ قبل از قبل سوچ بچار اسی خوف کی بنیاد ہیں جو میرے دل میں جاگزیں ہو رہا ہے۔

لیکن ـــــ لیکن میں اس خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا۔ اور اس نے اپنے جوان ارادوں کی شہہ پاکر بڑی بے اعتنائی سے سنگ تراش کی دوکان کی جانب نظریں اٹھائیں تو ترشا ترشا یا قبر کا تعویذ جوں کا توں دھرا تھا ـــــ اس کے دل پر ایک دھچکا سا لگا لیکن اس نے اس دھچکے کو اس طرح محسوس کرنے کی کوشش کی جیسے کسی میلے میں وہ کسی دوشیزہ سے ٹکرا گیا ہو لیکن قبر کا تعویذ بہرحال دوشیزہ نہ بن سکا۔

اس نے قبر کے اس تعویذ سے آنکھیں چرا کر سنگ تراش کی دوکان کا جائزہ لیا۔ قبروں کی بندش کیلئے بلا ترشے ہوئے پتھر اور قریب قریب ایک سائز کی کٹی ہوئی چھوٹی اور بڑی پتھر کی کڑیاں اس دوکان کے احاطے میں چو طرف ڈھیروں سے بکھری ہوئی تھیں اور انھیں میں ترشا ترشایا مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ، زنانی قبر کے تعویذ کے برابر ہی نمایاں طور پر رکھا گیا تھا کہ آسانی سے راہ گیروں کی نظر پڑ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کتنے ہی مسافر اس تعویذ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ اس بے اعتنائی میں ان مسافروں کا کوئی دوش

نہیں تھا۔ زندگی انھیں فرصت ہی کہاں دیتی تھی کہ وہ لمحہ بھر کے لئے موت کی طرف توجہ دیتے اور اگر سنگ تراش کی اس دوکان سے گذرتے ہوئے عاقبت کا کوئی مبہم سا تصوّر اُن کے ذہن میں ابھرتا بھی ہوگا تو یہ ایک لمحہ بہتے ہوئے وقت کے سمندر میں مل کر خود اپنی موت آپ مرجاتا ہوگا اور زندگی وقت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بنکر ہر مسافر کے آگے پھیل جاتی ہوگی جس سے بہرحال اس کو پار اترنا ہے۔

لیکن وہ جب پہلی بار اس راستے سے گذرا تھا تو سنگ تراش کی دوکان کے احاطے میں دھرے ہوئے اس بھاری بھرکم پتھّر کے تعویذ کو دیکھ کر اس کے دل میں اچانک ایک خیال آیا تھا کہ خدا جانے وہ شخص اب کہاں ہوگا اور کون ہوگا جس کی قبر پہ یہ تعویذ رکھا جائے گا۔ پھر اچانک ہی اس خیال نے کچھ اس طرح کروٹ لی تھی کہ وہ شخص اب یہیں ہے اور وہ خود ہے ــــــ اور وہ بوکھلا گیا تھا ــــــ کیا بکواس ہے کیسی بزدلی ہے یہ ــــــ اگر یوں ہوگا تو یوں ہی سہی ــــــ لیکن یوں ہوگا ہی کیوں ــــــ

راہ چلتے ایک خیال تھا جو اس کے ذہن سے یوں گذر گیا تھا جیسے کسی چھوٹے سے ویران پلیٹ فارم سے اکسپریس ٹرین بغیر ٹھہرے دندناتی گذر جاتی ہے اور پٹڑیاں کانپتی رہ جاتی ہیں اور اسٹیشن کی بلڈنگ منہ کھولے حیران حیران سی تکتی رہ جاتی ہے۔

اور پھر ٹرین کے گذر جانے پر اس پلیٹ فارم کی کس مپرسی زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے، اداسی زیادہ ہی ابھرتی ہے۔

اس کے دل سے بھی دندناتی ایکسپریس ٹرین کی طرح ایک خیال گذرا اور پھر وہی سب کچھ ہو گیا جو اجڑے پلیٹ فارم پر سے ٹرین کے گذر جانے سے ہوتا ہے۔

اب روزانہ کا اس کا معمول یہی تھا کہ دفتر جاتے ہوئے اور دفتر سے لوٹتے ہوئے یا تو وہ خود کو فریب دے کر اس قریبی راستے سے احتراز کرتا جو قبرستان اور سنگ تراش کی دوکان کے درمیان سے گذرتا تھا یا پھر اپنی اندرونی اضطراری کیفیت اور ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا اور اسی راستے پر چل پڑتا ـــ لیکن سنگ تراش کی دوکان کے پاس پہنچ کر اس کی نظریں اسی الجھن اور بے کلی کے عالم میں سنگ تراش کے احاطے کی جانب اٹھ جاتیں جہاں بھاری بھر کم تعویذ اس طرح دھرا رہتا جیسے اس کے سینے پر دھرا ہو ـــ اور وہ سینے پر اس کے بوجھ کو کم محسوس کرنے لگتا۔

ایک دن گذرتے گذرتے اس نے جھلّا کر طے کر لیا تھا کہ میں نہ صرف آج سنگ تراش کے احاطے کی طرف نہیں دیکھوں گا بلکہ مکمل پانچ دن تک ادھر نظر ہی نہ اٹھاؤں گا اور اس طرح بھول جاؤں گا کہ کوئی سنگ تراش کی دوکان راہ میں پڑتی ہے جس کے احاطے میں ایک قبر کا بھاری بھر کم تعویذ دھرا ہے۔ جو کسی نہ کسی مرنے والا کا منتظر ہے ـــ اور وہ مرنے والا ـــ اور وہ مرنے والا ـــ اور وہ مرنے والا ـــ میں میں ـــ میں ـــ اور وہ نظریں اٹھائے بغیر سنگ تراش کے احاطے کے برابر سے گذر گیا ـــ شام جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو کمان میں مڑتے ہی اسے خیال آگیا کہ اس سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر یں

اٹھائے بنا ہی گذر جاتا ہے سو پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

اب تو تین روز سے اس کا یہی معمول تھا ـــــ اس نے روزانہ دوبار کے حساب سے چھ وقت اسی راستے سے گذرنے کے باوجود سنگ تراش کے احاطے کی جانب نظر نہ اٹھائی تھی۔ چوتھے دن اس راہ سے گذرتے ہوئے اس نے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اب دز دیدہ نگاہوں سے احاطے کی طرف دیکھ لے ـــــ شاید وہ بھاری بھرکم تعویذ نہ رہا ہو ـــــ شاید کسی نے کسی بدنصیب کے لئے اسے خرید لیا ہو۔ لیکن پھر وہ اپنے پرقابو پالیتا۔ یاد کرتا کہ اس نے مکمل پانچ دن اس سمت نظر نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کو الجھن سی ہونے لگتی۔ جب وہ فیصلہ کرچکا ہے تو پھر اس کا دل اس احاطے کی طرف مائل ہی کیوں ہے۔ پھر وہ اپنے ہی استعمال کئے ہوئے الفاظ کی اصلاح کرتا ـــــ مائل ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو خائف ہے اور اسی خوف نے ازالے کے لئے وہ ادھر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اس بات کا معترف ہوچکا ہے کہ وہ قبر کے اس بھاری بھرکم تعویذ سے خوف کھاتا ہے۔

واپس ہوتے ہوئے اس نے سوچا کہ کل کا ایک ہی دن تو باقی ہے۔ پرسوں میں احاطے کی طرف دیکھوں گا ـــــ اور اگر تعویذ جوں کا توں دھرا ہے تو ـــــ تو کیا ـــــ دھرا رہے گا ـــــ میرا کیا لے جائے گا۔ میں بھی پھر دس دن تک ادھر نظر نہ اٹھاؤں گا۔ اور وہ نظریں نیچی کئے تیز تیز سائیکل دوڑاتا قبرستان اور سنگ تراش کے احاطے کے درمیان سے گذر گیا۔

پانچواں دن تو گویا اس کے صبر و تحمّل کا امتحان لے رہا تھا۔ دفتر جاتے ہوئے جب وہ اس راستے پر پڑا تو اس کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بھاری بھرکم تعویذ نہیں رہا ہوگا ــــ یقین ہو گیا گیا تھا۔ وہ یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں روزانہ کتنے ہی لوگ مرتے ہوں گے۔ پھر کسی نہ کسی کے لئے کسی نہ کسی نے یہ پتھر ضرور خرید لیا ہوگا۔

نہیں بھی خرید سکتا ہے ــــ ۔ ایسا سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہو گیا۔ لیکن اس نے سائیکل پر دوڑ لیتے ہوئے تیز تیز پیڈل مار کر جھوٹی ترنگ اپنے میں اسطرح پیدا کی جیسے انہیں سے مستعار لی ہے۔

شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ رہا تھا تو اس کو کسی کام سے اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں اور جانا پڑا اور اس طرح وہ اس راستے سے واپس نہ ہو سکا۔ لیکن جب وہ گھر پہنچا تو اس کے ذہن میں رہ رہ کر اس بھاری بھرکم تعویذ کا تصوّر ابھر رہا تھا ــــ اس نے گھر والوں سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ اپنے بچوں کو لے کر سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گیا۔ انھیں سویٹس دلائے۔ خود بڑھیا سگریٹ خرید کر حظ اٹھانے کی کوشش لیکن کوئی بہلاوا بھی اس کو اس بھاری بھرکم تعویذ کے خیال سے چھٹکارا نہ دلا سکا ــــ تو گویا تعویذ بھاری بھرکم سا پتھر تھا۔ جس کا بوجھ اپنے سینے پر وقفے وقفے سے وہ

رات اس نے خواب دیکھا کہ سنگ تراش کے احاطے میں ایک چھوٹا سا نیچہ اور مردوں، عورتوں اور بچوں کی کئی مورتیاں اِدھر اُدھر رکھی ہوئی ہیں۔ جن کے چہرے مسخ ہیں لیکن پتھروں کے وہ انبار ہیں نہ وہ بھاری بھرکم قبر کے تعویذ ــــ اس کو سنگ تراش کے احاطے کا یہ پراسرار ماحول کچھ اتنا نامانوس ... اور خائف ... تھا

آیا جو وہ پہلے دیکھتا رہا تھا۔ لیکن یکایک جب اس کی نظر اپنے ہی مجسمے پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا مجسمہ بالکل تازہ تازہ تراشا گیا ہے اور اتنا مسخ نہیں ہے جتنے دوسرے مجسّمے ہیں۔ کسی نامعلوم خوف سے وہ بیدار ہوگیا۔ آنکھیں کھلیں تو خود کو بستر پر پاکر اسے سکون ہوا لیکن جوں جوں اس خواب کی مبہم تصویریں اس کے ذہن میں ابھرتی گئیں وہ کچھ مضطرب سا ہوتا گیا اور اسی اضطراب کے عالم میں کئی بار اس نے بھاری بھرکم پتھر کے تعویذ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ اسے پھر گہری نیند نہ آئی۔ صبح تک وہ غنودگی بیداری اور نیم بیداری کے عالم میں کروٹیں لیتا رہا۔ صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا اور اعضا میں اضمحلال سا۔ اس نے نہا دھو کر کچھ فرحت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن اسے وہ تازگی نصیب نہ ہوئی جو وہ ہر روز نہا دھو کر محسوس کرتا تھا۔ اس نے چائے کی بجائے کافی خاص طور پر بنوا کر پی۔ روز کی طرح اس سے ناشتہ بھی کیا نہ گیا۔ انڈے والے کی آواز سن کر اس نے اسے بلایا۔ اپنے لئے ایک انڈا خریدا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کس طرح انڈا کھا سکتا ہے۔ اس نے سارے گھر کے لئے ایک ایک انڈا خریدا۔ حالانکہ کئی بار وہ تنہا انڈا کھا چکا تھا۔ نیم برشت انڈے میں بھی اسے وہ لذّت کام و دہن نہ ملی جس سے وہ آشنا تھا۔ وہ انڈے کو دوا کی گولی کی طرح نگل گیا اور گھڑی کی طرف نظر اٹھا کر اسطرح دیکھا جیسے پھر دیکھنے کی تمنا ہو اور بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا آنگن میں دھرے سائیکل تک پہنچا۔ کمانی دار قفل میں کنجی لگا کر جب اس نے پچھلے پہیئے کی زنجیر کھولنی چاہی تو وہ فوراً نہ کھلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اگر آج یہ قفل نہ کھلے تو وہ اسی بہانے دفتر نہ جائے گا۔ ویسے وہ چاہتا تو دفتر نہ جاتا۔ اسے رخصت کا حق تھا اور

بھلا گھر میں اسے کون ٹوک سکتا تھا۔ لیکن وہ تو آج دفتر نہ جانے کے لئے بھی کسی نہ کسی جواز کا متلاشی تھا ـــــ قفل کھل گیا اور سائیکل باہر نکال کر وہ با دلِ ناخواستہ دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔

آج جانے کیا بات تھی کہ پتھر کا تعویذ بار بار اس کے تصور میں پھر رہا تھا بات کیا ہو گی۔ یہی ہو گی کہ پانچ دن گذر گئے تھے اور آج چھٹا دن تھا اور آج وہ سنگتراش کے احاطے کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کا اپنے ہی معاہدہ کی رو سے مجاز تھا۔ وہ جوں جوں سنگ تراش کے احاطے کے قریب ہوتا جاتا اسے اپنی نبضیں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتیں اس نے پوری قوت کے ساتھ عقلی دلائل سے اپنے اس واہمے پر بھرپور وار کیا۔ کیا یہ انسانی عقل کا دیوالیہ نہیں ہے کہ ایک پتھر نے مجھے اتنا خائف اور ہراساں کر دیا ہے۔ کیا یہ رب العزت اور معبود حقیقی کی توہین نہیں ہے کہ میں موت کے ایک متعینہ وقت پر ایقان نہیں رکھتا ہوں۔ یہ کیسی بزدلی ہے جس کا میں شکار ہو گیا ہوں۔ میں اپنے ان توہمات کی داستان بھی تو کسی کو نہیں سنا سکتا۔ میرے ہمدرد خود مجھ پر ہنسیں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ اور اس نے جھرجھری سی لیکر اپنے ذہن کو اسطرح صاف کر دینے کی کوشش کی جیسے سلیٹ پر بھیگا ہوا کپڑا پھیر کر حروف مٹائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے دل نے جیسے آگے بڑھ کر ہمدردی کی۔ اپنا دکھ درد لوگوں سے کہہ دو۔ لوگ ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے تو شاید ان کے اسی رویئے سے تمہیں تقویت پہنچ سکے اور یہ بوجھ تمہارے ذہن سے ہٹ سکے۔ یہ پتھر تمہارے سینے پر سے سرک جائے۔ لیکن اس نے دل کے ہاتھوں شکست تسلیم نہیں کی۔ اپنے ذہن کو نئی دلیلوں سے اس طرح تیار کیا جیسے خود مدافعت کیلئے مسلح ہو رہا ہو۔

جب وہ اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے سیدھے گذر جانے پر وہ سنگ تراش کے احاطے کو چھوڑ بھی سکتا تھا تو اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے کوئی موٹر سن کرکے اس کے برابر سے گذر گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ سائیکل پر سے اتر پڑے اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا سنگ تراش کے احاطے اور قبرستان کے درمیانی راستے سے بہت اطمینان اور سنجیدگی سے گذر جانے کی سعی نا مشکور کرے۔ لیکن پھر اس کے دل نے ہی تردید کی۔

"سارا راستہ کیا پیدل طے کرکے آئے ہو"

"نہیں"

"تو پھر یہاں یہ خصوصیت کیوں برت رہے ہو ـــــ چلو ـــــ چلتے رہو رکو مت ـــــ" اور وہ سائیکل کے پیڈل گھماتا رہا۔ لیکن اس کی رفتار جانے کیوں سست ہو گئی تھی۔

جب وہ قریب پہنچ گیا تو اس نے ایک عزم صمیم کے ساتھ نظر اٹھائی تو قبرستان میں پھیلی ہوئی نئی پرانی قبروں پر دھوپ پھیل رہی تھی اور کتبوں کے سائے ملجے تھے۔ اور جب دوسری سمت سنگ تراش کے احاطے کی جانب اس نے نظر اٹھانے کی ہمت کی تو مردانی قبر کا بھاری بھرکم تعویذ جوں کا توں دھرا تھا لیکن اسکے پہلو سے زنانی قبر کا تعویذ غائب تھا جس کو وہ فوری محسوس بھی نہ کر سکا۔ لیکن پھر اسے خیال آ ہی گیا کہ یہاں کچھ اور بھی تھا۔

اداسیوں نے جیسے چاروں طرف سے اس پر یلغار کر دیا تھا۔ اس کا عالم یہ تھا جیسے اسے کوئی گلے لگانے تو وہ رو پڑے گا لیکن وہاں قبر کے بھاری بھرکم

تعویذ کے سوا اس کا اپنا تھا بھی کون ۔ کسی راہ رو کو اس کی دلی کیفیات اور جذبات
سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ لہٰذا وہ بغیر روئے ہی ایک بوجھ سا
اپنے دل و دماغ پر اٹھائے چپکے سے آفس پہنچ گیا اور اتنا اُداس رہا کہ دوپہر کو
انٹرول میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نہ اس نے کھانا کھایا نہ بات ہی کی ۔ اس نے دل ہی دل
میں محسوس کیا کہ پانچ دن تک اس جانب نظر نہ اٹھانے کا تہیہ کر کے اس نے کوئی اچھا کام
نہیں کیا ۔ ان پانچ دنوں سے اس نے غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر کچھ ایسی امیدیں وابستہ
کر لی تھیں کہ چھٹے دن پتھر کے منحوس تعویذ کو نہ دکھلانے کا اس کی آنکھوں نے جیسے اس
سے وعدہ کر رکھا تھا ۔ لیکن آج انھیں آنکھوں نے پھر وہی تعویذ دکھلایا تھا ۔ اس کو
لمحے بھر کے لئے اندھوں کی قسمت پر رشک آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنا یہ
خیال بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوا ۔ ساتھ ہی کچھ دیر بعد اس کو یہ خواہش ضرور ہوئی کہ میں
نے دنیا تو دیکھ لی ہے ۔ چاند، ستارے، سورج، جھاڑ، پہاڑ، آگ، پانی، بادل، ہوا،
زمین، آسمان، پھول پھل، بیوی، بچے اور اس کے بعد اگر میں اندھا ہو جاتا تو میری بقیہ زندگی
قبر کے اس تعویذ کو دیکھے بغیر ہی سکھ چین اور آرام و خوشی سے گذر جاتی اور اس کو اپنے
بینا ہونے پر دکھ سا ہوا ۔

آفس ختم کر کے جب وہ لوٹنے لگا تو اس نے قریب قریب اپنی شکست
تسلیم کر لی تھی ۔ وہ اس طرح سوچنے لگا تھا کہ اس کو یک لخت اس راستے سے
آمد و رفت بند کر دینی چاہیئے ۔ ایک عجیب سا تنہائی کا احساس اس کے وجود کو دنیا
کی چہل پہل سے اس طرح جدا کر رہا تھا ۔ جیسے دنیا دنیا نہ ہو ایک وسیع و عریض
قبرستان ہو جس میں دھری ہوئی اپنی میت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا ۔

ضد نہ کرو ـــــ اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔ اس راستے سے گذرنا ہی چھوڑ دو۔ کچھ ہی دن میں تم بھول جاؤ گے کہ وہاں کوئی قبرستان ہے جس کے سامنے ہی سنگ تراش کی دوکان ہے اور اس دوکان کے احاطے میں پتھر کا ایک بھاری بھرکم تعویذ ہے جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر دی ہے لیکن عقل نے پھر دلیلوں کا سہارا لیا۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو اور اس بات پر تیار ہو چکے ہو کہ اب تم بزدلوں کی سی زندگی گذارو گے۔ ایک واہمہ جب دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہزاروں ایسے وہمی دل تھام کر ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ تم نے کاش اتنا علم حاصل نہ کیا ہوتا۔ اپنی ساری کتابیں جلا دو ـــــ علم کی توہین انسان کی توہین ہے اور انسان رب العزت کا نمائندہ خصوصی ہے اور تم ـــــ

"چلو میں بھی شہر چل رہا ہوں" اس کے دوست نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور وہ چونک پڑا جیسے سینے پر پتھر کا تعویذ آ لگا ہو۔

منٹ بھر میں اس نے اپنے حواس درست کئے اور دوست کا ساتھ اس کے لئے ہمت اور طاقت بن گیا لیکن یہ طاقت بھی زیادہ دیر اس کی اپنی ہو کر نہ رہ سکی جب وہ اس موڑ پر پہنچے جہاں کمان میں سے ہو کر انھیں اسی قریبی راستے سے گذرنا ہوتا تھا تو اس کے دوست نے اپنی سائیکل اسی سمت یہ کہتے ہوئے گھمالی کہ "آؤ تمہیں ایک قریبی راستے سے لے چلوں شاید تم واقف ہی نہ ہو" تو وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے اپنی سائیکل بھی اسی سمت موڑ لی۔

اس کا دوست دنیا بھر کی باتیں کر رہا تھا اور وہ ہوں ہاں کئے جا رہا تھا اگر وہ پوچھ بیٹھتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تب بھی وہ اسی طرح ہوں ہاں کر دیتا جیسے

دوست کی کسی بات سے اتفاق کر رہا ہو۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ اپنے ساتھی کو روک کر وہ سائیکل سے اتر پڑے اور اس کے سینے پر سر رکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کرلے جو اس کی آنکھوں کے راستے بہہ جانے کے لئے تلا کھڑا تھا اور اس سے کہہ دے کہ آؤ ہم اس تعویذ کو اٹھا کر کسی دریا میں پھینک آئیں تاکہ میں ——— تاکہ میں کچھ اور زندہ رہ سکوں ——— وہ یہی سوچتا ہوا جب سنگ تراش کے احاطے کے قریب پہنچا تو اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اس نے اتنا راستہ طے کر لیا ہے ——— وہ اپنے ساتھی سے تو کچھ نہ کہہ سکا ——— خود اپنے آپ سے اس نے اتنا کہا کہ اب میں کبھی اس راستے سے نہ آؤں گا اور جب آخری بار دزدیدہ نگاہوں سے اس نے احاطے کی طرف نظر کی ———

آہ ——— اس کی زبان سے اس طرح نکلا کہ اس کے ساتھی نے بھی اس کی آواز سن لی۔

"کیا بات ہے ——— ؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

لیکن کچھ جواب دیئے بغیر بریک لگا کر اضطراری کیفیت میں وہ اپنی سائیکل سے کود پڑا۔

سنگ تراش کے احاطے میں مردانی قبر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ موجود تھا۔

"تم جاؤ ——— میں ذرا یہاں ٹھہروں گا ——— مجھے کچھ کام ہے" اس نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

اس کے ساتھی نے بغور اس کو دیکھا اور کچھ سمجھے بغیر چلا گیا تو اس نے سنگ تراش کے احاطے کا رُخ کیا۔

جب وہ اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا چھوٹی سی پتھریلی حصار کے قریب پہنچا تو اس کے دوست نے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

ہاں بھئی اللہ کا احسان ہے ـــــ اس نے اس نوارد کو پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ اسے بھی خیر خیریت پوچھنی چاہیئے جبکہ اس کا دوست سنگ تراش کے احاطے سے نکل رہا تھا، اس نے فوری سوال کیا۔

"کیا بات ہے، سب خیریت سے تو ہیں نا ـــ تم اس احاطے میں کہاں گئے تھے۔

اس کا دوست کچھ کہے سنے بغیر اس کے برابر سے گزرنے لگا تو اس نے ان کی بانہہ پکڑ کر بڑی نرمی سے پوچھا۔

"کچھ تو بتاؤ ـــ تم اتنے دل گیر کیوں ہو؟

اس کے دوست نے رک کر نظریں اٹھائیں تو وہ آبدیدہ تھا۔ کچھ توقف کر کے جب وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکا تو اس نے کہا "دیا منت نہیں"۔

"کب؟"

"آج پانچواں دن ہے۔ آج ہم نے اس کی قبر پختہ بنوا دی ہے۔"

"کیسا کڑیل جوان تھا یار" اس نے افسوس کرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے خود اپنی ہی آواز نہیں پہچان رہا ہو۔

اس کے دوست نے کچھ سنبھل کر پھر کہنا شروع کیا "آج فاتحہ ہے۔

میں اس کی قبر پر ہی جا رہا ہوں ۔ آج ہم نے اس کی قبر کا تعویذ یہیں سے خریدا تھا اور اب کتبہ دیکھنے کے لئے آیا تھا ۔ لیکن کوئی اچھا کتبہ یہاں نہیں ہے ۔"

"چلو میں بھی چلتا ہوں ۔۔۔" اس نے مری ہوئی آواز میں کہا ۔

جب وہ قبر پر پہنچے تو کچھ اور لوگ بھی موجود تھے ۔

ہاتھ اٹھا کر جب وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا تو اس کے سامنے ہی مردانی قبر کا وہ بھاری بھرکم تعویذ پھولوں سے ڈھکا ہوا ، آبدیدہ انسانوں کے درمیان دھرا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال بار بار ابھر رہا تھا کہ وہ آخری بار اس تعویذ کو دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔۔۔

لیکن اس پر کوئی یہ تہمت کیسے لگا سکتا تھا کہ اس کے یہ آنسو صرف غم واندوہ کا اظہار نہیں ہیں بلکہ کسی ڈھکی چھپی خوشی کا سبب بھی ہیں ۔

# زمین کا درد

میں جب قبرستان میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت شام کے دھندلوں نے اپنی
زندگی کی آخری سانسیں رات کے اندھیروں کو سونپ دی تھیں۔ رات دبے پاؤں میرے
دل کی اداسیوں کی طرح بڑھ رہی تھی۔ رات کیا چاہتی تھی اس کا مجھے علم نہ تھا۔ میں تو
یہ بھی نہ جانتا تھا کہ میری ہر لحظہ بڑھتی ہوئی اداسیاں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ میری جیب
میں وہسکی کی آدھی بوتل تھی جو آدھی سے کچھ زیادہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ مجھے کبھی کبھی ایسا
محسوس ہوا کہ حالات کا زہر پی کر زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا انسان شراب کا سہارا
لے کر بھی پچھتاتا ہے۔ آج پھر میں کچھ اسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ وہسکی کی آدھی بوتل
نے مجھے مسحور تو کیا ہے۔ لیکن زندگی کے اس زہر کو جو میری نس نس میں سرایت کر
گیا ہے۔ میں بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ انسان جس کی مجبوری پر مجھے
ہنسی آتی تھی۔ آج اس کے ہنسنے پر مجھے مجبوری کا گمان ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔

- زندگی کے اس سفر میں، میں اکیلا تو نہیں ہوں کتنے ہوں گے جو اخبار میں آدمی کے خلا میں تیرنے کی خبر پڑھ کر ان خلاؤں کے متعلق سوچتے ہوں گے جو اسی زمین پر ان کے اطراف پھیلے ہوئے ہیں اور چاند تک پہنچنے والا آدمی ان کا سینہ چیرنے کی دسترس نہیں رکھتا۔

میں جب اپنے ٹیبل پر بیٹھتا ہوں تو اس وقت تک ایک لفظ بھی مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔ جب تک میں شیشے پر آئی ہوئی گرد کو کپڑے سے صاف نہ کرلوں۔ اور جب میں لکھنا شروع کرتا ہوں تو یہ جان کر بھی مسکرا نہیں سکتا کہ میرے دل پر گرد کی جو تہیں جم گئی ہیں ان کو صاف کر کے چمکا دینا میرے ہونٹوں کی کسی مسکراہٹ کے بس میں نہیں ہے۔ میں باہر کی گرد جھاڑ دیتا ہوں، اندر کی گرد کو زادِ راہ سمجھ کر چل پڑتا ہوں۔

میں قبرستان سے ایک ہی جست میں آپ کو اپنی لکھنے کی میز تک لے آیا ہوں۔ لیکن مجھے قبرستان سے لکھنے کی میز تک ایک قدم کا فاصلہ بھی محسوس نہیں ہوا ہے حقیقت کے اس اظہار کو اگر آپ زندگی سے فرار کا نام دیتے ہوں تو مجھے خود پر نہیں آپ پر رحم آتا ہے کہ آپ سچ کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

چلئے میں پھر آپ کو قبرستان لئے چلتا ہوں۔ میں جس وقت یہاں پہنچا تھا تو میں نے اپنے بیٹے کی قبر کے پائینتی سر جھکا کر بیٹھے بیٹھے پپیہے کی آخری صدا سُنی تھی۔ میری آنکھوں اور قبرستان کے درمیان ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کی ایک چلمن سی حائل ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے سینے پر پھیلے ہوئے سفید بال دیکھ سکتا تھا جو میری شرٹ کا بٹن کھل جانے سے مجھے نظر آ رہے تھے۔

میرا بیٹا قبر میں سو رہا ہے۔ شام ڈوب رہی ہے پپیہا جانے کس کو

پکار رہا تھا اور ایسے میں آنسوؤں کی چلمن سے میں قبر کو بھی دیکھتا ہوں اور اپنے سینے کے سفید بالوں کو بھی۔ لیکن کیا آج کی زندگی جینے والوں کے لئے یہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہے؟

اگر یہی سب کچھ ہوتا تو مجھ پر وہسکی کی آدھی بوتل اپنا اثر نہ کرتی؟ میں اس کی قبر سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر نہ رو لیتا؟ ـــــ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھے اتنے آنسو ملیں کہ میں انھیں فراخ دلی سے بہا سکوں لیکن اتنے آنسو میں کہاں سے لاؤں۔ چاند تک پہنچنے والا آدمی اتنا عظیم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس آنسوؤں کا ورثہ نہیں رہا ہے۔ اور میں اپنے اس دور میں پیدا ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر جھوٹ حسین ہوتا ہے۔

کہانی شاید اس طرح نہیں بنتی جس طرح میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ کہانی تو رواں دواں ہوتی ہے۔ جیسے جاگتے آدمی کے سانس کی طرح مسلسل۔ بس یوں کہ کہانی شروع ہو اور آپ اس کے ہو رہیں ـــــ میں یہ سارے گر جانتا ہوں ـــــ لیکن میں آپ کو اکھڑی اکھڑی سانسوں کی کہانی سنانا چاہتا ہوں تو کہانی کا کیا ہوگا ـــــ پھر بھی میں اکھڑی اکھڑی سانسوں کو جوڑ کر انھیں مسلسل اور مربوط بنا کے آپ کو کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

جب رات نے اپنی سیاہ زلفیں زمین کے شانے پر پھیلا دیں تو زمین کی ساری ہنگامہ آرائیاں چین کی نیند سو گئیں ـــــ اور یہ تو قبرستان تھا جہاں میں تھا ـــــ یہاں تو زمین سانس بھی نہیں لیتی کہ کوئی سونے والا جاگ پڑے گا اور اس کے زخم ہرے ہوں گے۔

میں سگریٹ جلا کر اس کی قبر کے پائینتی بیٹھ گیا ہوں۔ جس چہرے پر پھولوں کا سہرا دیکھنے کی تمنا تھی اس کو میں نے منوں مٹی کے نیچے چھپا کر پالش کئے ہوئے پتھر سے ڈھک دیا ہے اور اب یہی پتھر مجھے پیارے ہیں جن پر میں نے پھول بکھیر دیئے ہیں اگر بتیاں جلا کر سرہانے رکھ دی ہیں اور بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوں۔

تاریکی بڑھنے لگی تو سناٹے اور شدید ہو گئے شہر خموشاں مُردوں کا شہر نہیں ہوتا اگر آپ کو اس شہر کا ایک باسی بھی پیارا ہو اور میں جس کی قبر کے پائینتی بیٹھا ہوں وہ تو مجھے بہت پیارا تھا ــــــ میں نے موم بتیاں جلا کر مڈیر کی محرابوں میں رکھ دی ہیں۔ میرے چاروں طرف اُجالے پھیل گئے ہیں اور میرے بیٹے کی قبر کے سیدھی جانب دوسری قبروں کے کتبوں کے سائے کتبوں سے چمٹنے کے لئے چلے آئے ہیں۔ اندھیرے میں سائے بھی ساتھ نہیں رہتے۔

یہ قبرستان بہت وسیع ہے۔ یوں سمجھئے اب میں اس کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوں میرے چاروں طرف قبریں بکھری ہوئی ہیں، چھوٹی بڑی، نئی، پرانی، بہت پرانی۔ میرے پشت پر چبوترے کے احاطے کی دیوار سے پرے ایک مکان ہے۔ یہ مکان آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا ہے۔ اور ایک بہت بڑی قبر کے مانند لگتا ہے۔ جس میں کئی لوگ زندہ دفن ہیں اس مکان اور محصور چبوترے کے درمیان جس پر میں ہوں آنے جانے والوں کے لئے راستہ چھوڑ کر زمین کا چپہ چپہ استعمال کیا گیا ہے اور جو بچ رہا ہے وہ مرنے والوں کا منتظر ہے۔

روشنی کے اس دھچکے نے جو ابھی ابھی موم بتیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے۔ میرا سکون چھین لیا ہے۔ میں پھونک مار کر موم بتیاں بجھا دیتا ہوں۔

سچ پوچھئے تو جب میں یہاں ہوتا ہوں تو مجھے ان اجالوں سے ڈر لگتا ہے اور یہ ڈر مجھے اپنے اطراف پھیلی ہوئی موت سے نہیں لگتا بلکہ اس زندگی سے لگتا ہے جو کھنڈر بنتے ہوئے مکان میں سے مجھے تاکتی ہے۔ میرے بیٹے کی قبر کے اطراف اجالا دیکھ کر اس گھر میں رہنے والے یہ جان جاتے ہیں کہ میں آگیا ہوں۔ پھر اس گھر میں سے ایک ماں نکلتی ہے جو راستہ ڈھونڈھتی ہوئی قبروں قبروں ہی پر پیر رکھتی ہوئی سے پاؤں محصور احاطے تک پہنچ جاتی ہے۔ جہاں میں اس کی آمد سے بے خبر بیٹھا ہوں ــــــ وہ بہت آہستہ چھوٹا سا لکڑی کا گیٹ کھول کر بلی کی طرح داخل ہوتی ہے۔ بھیڑ بکریوں کے داخلے سے روکنے کے لئے جو گیٹ بنایا گیا ہے اسی گیٹ سے ہو کر یہ بھی احاطے میں میرے قریب تک چلی آتی ہے۔ میں اگر قدموں کی چاپ نہیں سن پاتا ہوں اور اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا ہوں تو وہ کچھ دیر کھڑی رہتی ہے۔

پھر مجھ سے کہتی ہے۔

اٹھو ـــــــ جس کی امانت تھی اس نے تم سے چھین لی ہے۔

اور میرے دل پر ایک مکا سا لگتا ہے ــــــ میں اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جیسے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں کہ وہ مجھے میری تنہائیاں دے دے۔ مجھے اس جگہ اکیلا چھوڑ دے تاکہ میں جب تک جی چاہے چپ چاپ بیٹھا رہوں۔ پھر چلا جاؤں لیکن کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے والی نوجوان لڑکیوں کی یہ ماں دراصل ہندستان بھر کی ماؤں کی روح معلوم ہوتی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں عالم ارواح میں پہونچ گیا ہوں۔ اور یہ اُداس اور سُتا ہوا چہرہ جو میرے مقابل ہے دراصل ایک روح ہے ایک ایسی ماں کی روح جس کی چھ لڑکیاں جوان ہیں اور ان جوانیوں کو دفنانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

مجھ سے دو چار اُلٹی سیدھی تسلیوں کی باتیں کر کے وہ اپنی رام کہانی لے بیٹھتی ہے۔ بیچ بیچ میں مجھے نصیحت بھی کرتی جاتی ہے کہ میں غم نہ کروں۔ یوں کرنا شاید اس لئے وہ ضروری سمجھتی ہے کہ مجھے احساس دلاتی رہے کہ اس کے دل میں میرے لئے ہمدردی ہے۔ حالانکہ وہ خود ہمدردیاں بٹورنے چلی آئی ہے۔

بی جان ابی کا روزی کا ددیٹے برسوں میں نئے اَونے پونے بیچ دیا۔ اس کی شادی کے لئے کب سے اٹھا رکھا تھا ـــــ جب میں نے دوکان دار کے بیر بیٹھے لئے کہ چھ پہاڑ سینے پر دھرے ہیں۔ انھیں ٹھوکوا مارنا مجھ سے ممکن ہوتا تو میں بھی کسی قبر میں چین کی نیند سو جاتی۔ جینے میں اب مزہ نہیں، اذیت ہے لیکن یہ اذیت میں انھیں لونڈیوں کے لئے برداشت کرتی ہوں ورنہ زندگی سے جی اوب گیا ہے۔ میاں۔ یہ لوگ اچھے ہیں جو چین کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ قبرستان کی طرف اشارہ کر کے کہتی۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ اب ٹل جائے۔ میں اس کی بکواس سے تنگ آ گیا ہوں مجھے اپنی تنہائی کے لٹنے کا غم ہے۔ اور یہ عالمِ ارواح کی ماں جو قبروں پر پاؤں رکھ کر دبے دبے میرے پیچھے چلی آئی ہے۔ اپنے سینے پر چھ پہاڑوں کا بوجھ لئے میرا سایہ بن گئی ہے ـــــ وہ پھر کہنے لگی ہے کہ ـــــ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیل چھڑک کر سب کو جلا ڈالوں اور خود بھی جل مروں۔ کتنے ہی خاندان تنگ آ کر جب ایسا کچھ کرتے ہیں تو ان کی بے دردی پر الجھن ہوتی ہے۔ سوچتی ہوں اُن کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہوں گے۔ لیکن دو روز زندہ رہنے کی کوشش میں گذرتے ہیں تو اپنی ہی مجبوریاں ہم سے کہتی ہیں کہ پتھر تو تمہارے سینوں میں ہیں جو ایسی زندگی جی رہے ہو۔

میں اُٹھتا ہوں اور اس سے چھٹکارا پانے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ آداب سلام

کے بعد میں اس کو اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ وہ پھر کچھ مجھ سے کہہ سکے ۔

اس وقت تو وہ میرے پاس نہیں ہے ۔ اس وقت تو میں اکیلا ہوں۔
لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ وہ آ نہ جائے ـــــــ روشنی کے اس دھبّے نے جو ابھی ابھی موم بتّیاں جلانے سے میرے اطراف پھیل گیا ہے، میرا سکون چھین لیا ہے ۔ میں پھونک مار کر موم بتّیاں بجھا دیتا ہوں ۔ روشنی کے یکایک غائب ہو جانے سے اندھیرے زیادہ گہرے ہو گئے ہیں ۔ لیکن آنکھیں دیکھتے دیکھتے ان اندھیروں سے مانوس ہو گئی ہیں اور اب میں اپنے سامنے گنبد کا ہرا دروازہ ہمیشہ کی طرح دیکھ سکتا ہوں، جو بند ہے ۔ اس گنبد میں میرے جدِ امجد یا پھر ان کے بھی جدِ امجد سو رہے ہیں ۔ میں نے صحیح رشتہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی ـــــــ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے علم کے دریا بہائے ہیں ۔ انسانوں کے انبوہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہے ۔ ان سے عرفان و آگہی حاصل کی ہے ۔ بہرحال میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن کے اعمال دامنِ صاف پر چاہوں تو میں بھی فخر کر سکتا ہوں جس طرح ماؤں کی وہ پیاسی روح کرتی ہے جو کھنڈر ہوتے ہوئے بنگلے سے نکل کر دبے پاؤں میرے پیچھے موم بتی کی روشنی کا دھبہ دیکھ کر چلی آتی ہے ۔ گنبد میں سونے والی ان برگزیدہ ہستیوں سے اس عورت کا رشتہ زیادہ قریبی ہے ۔

مجھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہوئے اس گنبد کو دیکھ کر اپنا بچپن یاد آیا ۔

پتہ نہیں گنبد کے ساتھ بھیک مانگنے کی رسم کیوں وابستہ ہو گئی ہے ۔ آج سوچتا ہوں تو صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے اچھے دنوں پر برے دنوں کی پرچھائیاں ہمارے بچپن ہی میں پڑنے لگی ہوں گی کہ ماؤں نے دادا سے علم مانگنے کے لئے نہیں

کہاں پیسہ مانگنے کے لئے آ سمایا۔

اب میری آنکھیں اندھیروں سے اتنی مانوس ہوگئی ہیں کہ دور تک دیکھ سکتی ہیں۔ لیکن یہاں دیکھنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں قبریں ہیں جہاں میں نہیں دیکھ سکتا ہوں وہاں بھی قبریں ہیں جو دن کے اجالے میں مجھے نظر آتی تھیں اور اب آنکھوں سے اوجھل ہیں پاس ہی بوڑھے املی کے درخت کے نیچے ایک جگنو بھٹک رہا ہے۔ کوئی مسافر یہاں ہوتا تو اس جگنو کی روشنی میں بھی راستہ پانے کی سوچ سکتا تھا لیکن یہاں تو سارے مسافر تھک کر سو گئے ہیں اور ایسا سوئے ہیں کہ انھیں نہ سورج کی کرنیں جگا سکتی ہیں نہ بارش کی بوندیں۔ ایسے میں یہاں جگنو کا وجود بالکل فضول معلوم ہوتا ہے۔

کسی قبر پر کوئی چراغ نہیں ہے۔ چراغ خود بخود بھی تو نہیں جلتے۔ اب زندگی کو اتنی فرصت بھی کہاں ہے کہ موت کے راستوں میں چراغاں کرتی پھرے۔

میں خود بھی تو مہینوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔ جس شخص کا چہرہ دن میں دس بار دیکھے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ اس کی قبر کی طرف مہینوں میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا ہے یہ سوچ کر جی کتنا اداس ہو جاتا ہے کہ کل ہم بھی ذہنوں سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے جب اپنے معمول کے خلاف میں پندرہ بیس دن کی تاخیر سے قبرستان کو گیا تو مجھ سے اسی پاگل ماں کی روح نے کہا تھا۔

"اس وقت تم یہاں کیسے آ سکتے ہو۔ اس وقت تو تمہیں فلاں سنگ کے کیمپ میں ہونا چاہیئے تھا" ——— اور اس سے پہلے کہ اس سے میں کچھ کہتا۔ اس نے خود جواب گھڑ دیا

—— تم اسی لئے اتنے دن نہیں آئے ہو ——

کیوں ہے نا۔

جب یہ باتیں ہوئی تھیں اس وقت اندھیرے بھی نہیں تھے جو مجھے چھپا لیتے سورج ابھی نکلا نہ تھا۔ نکلنے کے لئے سنور رہا تھا۔ وہ اطمینان سے میری پشت پر احاطے کی دیوار تک چلی آئی تھی۔

آج مہینوں بعد میں یہاں آیا ہوں تو میں نے خود جلائی ہوئی موم بتیاں پھونک مار کر بجھا دی ہیں لیکن اس وقت جب موم بتیوں کے شعلے لرز کر بجھنے والے تھے۔ میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھول دیکھے مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ دراصل یہ میری بھول تھی۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں نے ہی پھول چڑھائے ہیں۔ لیکن جب میری آنکھیں اندھیروں سے مانوس ہوئیں اور جب میں نے گنبد کے ہرے دروازے کو بند دیکھا تو اس دروازے کی درز سے مجھے اپنا سرکش بچپن جھانکتا ہوا نظر آیا۔ جو نانا حضرت سے پیسہ مانگنے کی اہانت کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکا تھا اور جب ان یادوں کو گنبد کی تاریکیوں میں پھینک کر میرا ذہن اپنے بیٹے کی قبر پر واپس آیا تو میں نے سگریٹ جلانے کے لئے کیتے کی اوٹ میں چھپ کر اس احتیاط سے تیلی جلائی کہ لمحہ بھر کو پھیلنے والی یہ روشنی بھی کھنڈر ہوتے ہوئے مکان میں رہنے والی لیلٰی اُن کی نظروں سے چھپی رہے۔ لیکن میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا —— مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ ہوا۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا سچ تھا —— وہ کون ہے؟ —— وہ کون ہے جو میرے غم میں شریک ہو گیا ہے۔ وہ پھول جو میں قبر پر چڑھانے کے لئے لایا تھا وہ

تو بیل کے بھیگے ہوئے پتوں میں محفوظ تھے ۔ان پر لپٹا ہوا تاگا تگ جوں کا توں تھا۔ پھر تازہ پھول اٹھا کر اپنی آنکھوں سے بالکل قریب کر لئے۔میری انگلیوں کی پوروں نے پھولوں کی نمی اور ٹھنڈک محسوس کی ــــــ ہمیں سورج کی کرنوں نے نہیں چھوا ہے۔ نرم پھول میری بھیگی ہوئی پلکوں سے کہہ رہے تھے ۔میں نے انھیں قبر پر اس احتیاط سے رکھ دیا۔ جیسے پلکوں میں آنسو پرو رہا ہوں۔

جی چاہا موم بتیاں جلا کر اس پگلی رات کا انتظار کروں جو روح کی طرح قدموں کی کسی چاپ کے بغیر میرے پیچھے چلی آئی ہے۔ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر موم بتیاں جلا دیں تازہ پھولوں نے میرے بیٹے کی قبر کے پالش کئے ہوئے پتھروں پر اپنی نمی کے نقش چھوڑ رکھے ہیں۔میں نے انھیں چومنا چاہا تو میرا سایہ قبر پر ڈول گیا۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔وہسکی کی بوتل سے کڑوے سے گھونٹ لئے۔پھر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اس طرح چپکا سا بیٹھ رہا جیسے قبروں سے سانسوں کی آواز سن رہا ہوں۔

پاس کے اجالے نے دور کے اندھیرے کو اور گہرا کر دیا تھا۔نیم کے بوڑھے درخت کی بلندیوں کو اب ایک نہیں کئی جگنو چھو رہے تھے۔یہاں اگر جگنوؤں کا کھیت بھی بچھا دیا جائے تو بے فائدہ ــــــ یہاں جگنو کی چمک موم بتی کے اجالے قمقموں کی بجلی کچھ بھی دلوں کے اندھیروں کو دور کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مجھے محسوس ہوا کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے ــــــ میں نے پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں ہے۔لیکن وہ کون ہے ــــــ وہ ــــــ بوڑھے نیم کے گھنے اندھیرے میں۔

میں کھڑا ہو گیا ہوں ــــــ میں نے بغور دیکھا ہے ۔ یقیناً کوئی

ہے۔

میں آہستہ آہستہ احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی قبر پر نظر ڈالی۔ موم بتی کی روشنی میں بھی اس کے کتبے پر کندہ اس کا نام، اس کی تاریخ پیدائش، اس کی تاریخ وفات کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اس عبارت کی سیاہی مٹ گئی ہے۔ میں کچھ اور دکھی ہو گیا ہوں۔ کسی کتبے کے حروف مٹ رہے ہوں تو سمجھو کہ اس کے رونے والے کے دل سے اس کی یاد مٹ رہی ہے۔

میں سر جھکائے احاطے کی دیوار سے لگا ہوا دبے پاؤں بوڑھے املی کے درخت کی جانب چل رہا ہوں۔ اب یہاں سے دور تک شکستہ قبروں کا سلسلہ ہے۔ ایسی قبروں کا سلسلہ جن کے رونے والے کوئی نہیں رہے ہیں۔ میں چلتا چلتا ٹھہر جاتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر، یہ جان کر تکلیف سی ہوتی ہے کہ میں جسے ناہموار زمین سمجھ رہا ہوں وہ دراصل کوئی قبر ہے ایسی قبر جسے پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ایک خیال میرے ذہن سے تیر کی طرح سنسناتا ہوا گذرتا ہے۔ کیا یوں بھی ہوگا کہ کبھی کوئی میرے بیٹے کی قبر سے اسی طرح گذرتا ہوا لمحہ بھر کو رک کر کچھ سوچے گا —— نہیں —— ایسا نہیں ہوگا —— کبھی نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا کتبہ جیسے میرے سینے پر آ لگا ہے۔ مجھے پڑھو —— تمہارے جیتے جی میری یہ حالت ہے۔ میرے حروف مٹ رہے ہیں۔ تمہارے زخم بھر رہے ہیں —— آؤ ان حروف پر پھر سے سیاہی پھیر کر اپنے زخم ہرے کر لو۔

میں ناہموار شکستہ قبر پر سے اتر کر اس طرح چل رہا ہوں جیسے پیر زمین پر رکھنا ہی نہیں چاہتا ہوں —— اب میں بوڑھے املی کے پیڑ کے بالکل پاس

پہنچ گیا ہوں۔ خود رو جنگلی جھاڑیوں کے ایک جھنڈ نے میری نظروں کو آگے بڑھنے سے روک کر اپنے ہی میں الجھا رکھا ہے۔ میں گھوم کر جھنڈ کے اس سمت پہنچتا ہوں جو نیم کے بالکل نیچے ہے۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا ہوں۔ تازہ قبر کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن وہ مجھے نہ دیکھ سکی۔ میں نے اس کو پہچان لیا ہے۔ یہ وہی روح ہے جس کا موم بتیاں جلا کر میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر انتظار کیا ہے لیکن روشنی کے دھبوں کی جانب بے تحاشہ بڑھنے والی یہ روح آج اس تازہ قبر پر اندھیروں کی ہو کر رہ گئی ہے۔

"کس کی قبر ہے یہ ؟"

میں نے اس سوال سے پہلے کسی اور سوال کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔

"تم کون ہو ؟"

میں اسے دیکھتا رہ گیا ——— وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ہنسی ——— اس کی ہنسی سے مجھے وحشت سی ہوئی۔

"اٹھو ——— جس کی امانت تھی اس نے تم سے واپس لے لی ہے۔"

——— میں نے دل مضبوط کر کے یہ جملہ کہہ دیا۔

اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھا ——— پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری بی جان کی قبر ہے یہ ——— وہ سنو۔ سنتے ہو؟ بی جان کا بچہ رو رہا ہے۔"

"بی جان کا !!"

لیکن جلد ہی میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں اور اس کا منہ تکتا رہ گیا بھلا میں
اس سے یہ پوچھ کر بھی کیا کرتا کہ بی جان کا عقد اسی سے کر دیتیں جس کا یہ بچہ ہے۔
اور پھر اس نے مجھے بات کرنے کی مہلت بھی تو نہیں دی۔

ٹوٹی ہوئی قبروں پر پیر رکھتی ہوئی وہ اپنی کھنڈر ہوتی ہوئی حویلی کی طرف
تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ اور کھنڈر سے کسی نومولود بچے کے بلک بلک کر رونے
کی آواز میں صاف سن رہا تھا۔

اپنے بیٹے کی قبر پر لوٹتے وقت میں نے اس قبر کو نہ روندنے کے خیال
سے جس کی شکستگی نے میرا دل ہلا دیا تھا جانے کتنی قبریں روند ڈالیں جو سرے سے
مٹ چکی تھیں۔

ہوا کے کسی آوارہ جھونکے نے میرے بیٹے کی قبر کا دیا بجھا دیا ہے
لیکن جب میں اس کی تربت کے پائینتی پہنچا ہوں تو درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا
چاند اب اتنا ابھر گیا ہے کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں اور ہلکی مدھم چاندنی
اطراف میں بکھر کر ٹوٹ گئی ہے۔

میں نے بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار لئے۔
میں نے کھنڈر سے آتی ہوئی نومولود بچے کے رونے کی آواز پھر سنی۔
میں نے اپنے بیٹے کی قبر پر تازہ پھولوں کو پھر دیکھا اور سوچا بھی نہیں کہ
یہ کس نے چڑھائے ہیں۔

میں نے پھولوں کا دونا کھول کر وہ پھول بھی قبر پر چڑھا دیئے جو میں اسی
لئے لایا تھا۔

میں نے سگریٹ جلا کر چاند کو دیکھا ـــــــــ وہ اب درختوں سے بلند ہو کر بادل کی اوٹ میں چھپ رہا ہے۔

مجھے محسوس ہوا جیسے چاند مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تم لوگ مجھ تک تو پہنچ گئے ہو تو میں لرز رہا ہوں۔ خدارا زمین کے درد کو زمین ہی پر چھوڑ آؤ۔ اپنے سینوں میں چھپا کر اسے کبھی ساتھ نہ لے آنا۔ میرے سینے میں اتنی وسعت کہاں ہے جو زمین کا سارا دکھ سمیٹ سکوں۔

اور چاند نے بادل کی چادر تان لی۔
میں ہر چاند کو کفن تو نہیں کہہ سکتا۔


دُھوپ

جمالے جب لکڑی کا برادہ لوہے کی ٹوکری میں سمیٹنے لگا تو کرن سنگھ گرجا۔

"یہ کام تیرا نہیں ہے" جر وادے مزدوراں؛ ـــــ شیخو حرامی سے کیوں نہیں کہتا کہ وہ اٹھائے کوڑا کرکٹ"

جمالے اس طرح چونکا جیسے رندہ کرنے کی لکڑی پر غلطی سے آری چلاتا ہوا پکڑا گیا ہو۔

شیخو کہیں آس پاس ہی جھاڑ کے سائے میں کالے کالے جامن یا آئس فروٹ کھاتا رہتا۔ کرن سنگھ کی آواز اس کے کانوں میں کن کھجورے کے مانند کلبلاتی اور وہ جیسے درد سے تڑپ اٹھتا۔ جامنیں منہ میں اس طرح ٹھونس لیتا کہ گلے ابھر آتے اور جو آئس فروٹ ہاتھ میں ہوتا تو بڑا ٹکڑا منہ میں رکھ لیتا کہ ٹھنڈک سے آنکھیں مند

باتیں۔
شیخو کی حکمرانی کرن سنگھ کی پہلی آواز ہی پر ختم ہو جاتی تھی۔ جب تک کرن سنگھ
کارخانے کے برابر ہی اپنے گھر میں بیوی بچوں میں مگن رہتا، شیخو گنگناتا، اتراتا، ہر ایک
سے ٹھول کرتا پھرتا، گول مول سا سانولا سلونا، نک سکھ کا درست، نمکین چہرے والا
چلبلا لونڈا اپنے چاہنے والے کاریگروں کے درمیان ایسے ایسے نخرے اور غمزے کرتا کہ وہ
کاریگر بھی جنھیں ایسی باتوں کی چاٹ نہ تھی اس کی طرف دیکھنے لگتے۔
جمالے تو شیخو پر مرتا تھا ـــ اور شیخو بھی جانتا تھا کہ جمالے کیا چاہتا ہے
سالے کالے جامن، چکی چکی، آئس فروٹ، امرود اور آم روزانہ صبح ڈیوٹی
پر چڑھتے ہی کچھ نہ کچھ شیخو کے ہاتھوں میں ہوتا اور جمالے کی جیب ہلکی ہوتی۔
کارخانے میں وقت سے پہلے آنے والے کاریگروں میں جمالے اور شیخو کا
کوئی مقابل نہ تھا۔ یہ دونوں کارخانے کے لئے کم اور ایک دوسرے کے لئے زیادہ
وقت سے پہلے ہی چلے آتے۔
لیکن جمالے مطلب کی بات کبھی نہ کر سکتا ـــ سوچ سوچ کر رہ جاتا۔ شیخو
کبھی جمالے کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاتا۔ کبھی پیچھے سے آکر اس کی کمر سے لپٹ
جاتا اور کبھی چوانی، کبھی دس پندرہ پیسے جو بھی مل جاتا جھپٹ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ پھر
وہ اتنی دیر تک کارخانے کے باہر رہتا کہ دوسرے کاریگر آنے لگتے۔ پھر کرن سنگھ
کے باہر نکلنے کا وقت قریب آجاتا اور سب کاریگر اپنے اپنے کام پر جٹ جاتے کہ مالک آئے
تو انھیں مصروف دیکھے اور ان کی کارکردگی پر اسے شبہ نہ ہو۔
کرن سنگھ دوہرے بدن کا لحیم شحیم آدمی تھا۔ کاریگروں کا خیال تھا کہ وہ

باہر سے سخت اور کھردرا ہے اور اندر سے نرم اور گداز۔ سارے کاریگر اس سے خوف بھی کھاتے اور چاہتے بھی تھے۔ سارے شہر میں کرن سنگھ کا نام فرنیچر میکر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی نفاست مثالی ہو گئی تھی۔ ایک معمولی سی تپائی بھی جب تک وہ جانچ پڑتال نہ کر لیتا گاہک کو نہ دی جاتی۔

"پیسہ کمانا آسان ہے نام کمانا مشکل" —— وہ گاہکوں سے کہتا۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ چیز بنکر تیار ہے۔ گاہک کو پسند ہے اور وہ مطمئن ہے۔ پیسے گن کر جب وہ کرن سنگھ کے ہاتھ میں رکھنے کے لئے بڑھتا تو کرن سنگھ ہاتھ کھینچ لیتا۔

"منشی جی" —— اس کی کراری آواز بے در و دیوار کے کارخانے میں بھی گنبد کی طرح گونجتی ——

"صاحب نے کیا چیز پسند کی ہے؟"

منشی جی کھچڑی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اٹھتے اور صاحب کی پسند کی ہوئی چیز نکلوا کر کرن سنگھ کے سامنے رکھوا دیتے —— وہ الٹ پھیر کر نیچے اوپر اچھی طرح جانچ پڑتال کرتا ——

کبھی کہتا "آپ پانچ دس منٹ ٹھہر جائیے صاحب"

صاحب ٹھہر جاتے تو کاریگروں کو ہدایت دیتا کہ فلاں سائیڈ میں کیلے نکال کر اسکرو فٹ کر دو، کبھی کہتا کہ وارنش کا فنشنگ ٹچ دے دو، کبھی کہتا کہ نچلی راڈ کے متوازی ایک پٹی لگا دو۔

اگر کام زیادہ ہوتا تو صاف کہہ دیتا "کہ آج نہ لے جائیے صاحب۔ کل لے

جا ئیے میں مطمئن نہیں ہوں ۔"

اس طرح کرن سنگھ نے کئی بار نقصان بھی اٹھایا ۔کیونکہ کرن سنگھ کی کل ہوئی بھی، اس نے اپنی مرضی کے مطابق چیز کو بہتر سے بہتر بنا کر رکھا بھی لیکن جانے والے کی کل نہیں ہوئی اور چیز دھری دھری گرد میں اٹتی رہی تو کرن سنگھ نے اٹھوا کر پھر گودام میں رکھوا دیا۔

کرن سنگھ واقعی عجیب نازک مزاج آدمی تھا ۔ جب انتظار کرکے چیز گودام میں بھجوا دی جاتی اور اگر وہی گاہک آدھمکتا جو پسند کرکے رکھوا گیا تھا تو پھر کرن سنگھ کا پارہ چڑھ جاتا ۔

"جناب اب وہ چیز نہیں ملے گی ۔"

"کیوں ۔کیا بک گئی ؟"

"بکی نہیں، دھری ہے، مگر دوں گا نہیں"

"کیوں نہیں دیں گے ؟"

اسی لئے نہیں دوں گا کہ آپ اسی روز آنے والے تھے اور آئے اتنے دنوں بعد میں ۔ کرن سنگھ وقت کے ساتھ چلتا ہے ۔ نہ وقت ٹھہرتا ہے نہ کرن سنگھ اور آپ تو جانتے ہی ہیں، موٹی سی بات ہے ۔گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ۔"

اب اگر گاہک بھی سرپھرا ہوتا تو منہ پھلا کر چلا جاتا ۔ ورنہ کاریگر اسے آہستہ سے سمجھا دیتا ۔

"سیٹھ صاحب وعدہ خلافی سے بہت چڑھتے ہیں ۔۔۔ ہر وہ وعدہ جو وفا نہیں ہوتا، انھیں بہت دکھ پہنچاتا ہے ۔ جانے وہ کیا کیا سوچنے لگتے ہیں ۔۔۔ آپ کل آکر گودام میں چیزیں دیکھئے اور پھر اسی چیز کو پسند کر لیجئے ۔ تب معاملہ پٹ

پٹ جائے گا۔"

خواہش مند کی طلب صادق ہوتی یا ضرورت اشد تو وہ دوسرے دن ضرور آتا اور کرن سنگھ مسکراتا اور چیز حوالے کرتا ہوا کہتا۔

" جناب میری محبوبہ نے مجھ سے آنے کا وعدہ کیا لیکن آج تک نہیں آئی۔ میں آج بھی اس کا منتظر ہوں۔ اور اگر آج وہ آجائے تو پتہ ہے میں کیا کہوں گا۔"

جا مورا تو سے پیارا نہ نہیں

جا، میں نے تو ہے پہچانا نہیں

کرن سنگھ یہ کہہ کر کہیں دور دور کچھ دیکھنے لگتا جیسے کسی کو آتا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن فوراً ہی قہقہہ مار کر دھندے سے آلگتا ــــــ گاہک کچھ بھی نہ دیکھتا کہ کرن سنگھ کہاں کہاں کی سیر کر آیا ہے ــــــ وہ اپنی چیز پا کر خوش تھا ــــــ بات ختم ہوتی۔

شیخو کی کرن سنگھ سے روح فنا ہوتی تھی۔ جب وہ کام کی دیکھ بھال کے لئے چکر لگانے نکلتا تو شیخو کونے کونے چھپتا پھرتا۔ حالانکہ کرن سنگھ کے ہاتھوں شیخو کی کبھی پٹائی ہوئی نہ گالی گلوچ ہی اس نے سنی ــــــ لیکن وہ یوں ہراساں رہتا جیسے بارش کی بوندوں سے چھیل چھبیلی بکری جس کے پیچھے منڈ بو کرٹ بھی بعبغا رہا ہو۔

شیخو کی ہراسانی کا راز نہ کھلتا تھا ــــــ لیکن بہت دنوں بعد معلوم ہوا کہ کرن سنگھ نے اس کو ایک بار جمالے کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور دونوں ہی کو خوب پھٹکارا تھا۔

اس روز سے یوں بھی دیکھا جاتا کہ کسی ایسے ویسے جذبے سے مغلوب ہو کر

جمالے نے ایسی جسارت کی شیخو کو پکڑ کر اپنی گود میں بھر لینا چاہا تو شیخو نے جب کچھ نہ چلی تو یہ داؤں لگایا۔

" وہ دیکھو مالک دیکھ رہا ہے۔ چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو بھی "

بس جمالے کی ساری مردمی زائل ہو جاتی۔ وہ جانتا تھا کہ کرن سنگھ کارخانے کے ہر روزن سے جھانکتا ہے۔ یہاں کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں اس نے اپنی آنکھیں نہیں رکھ چھوڑی ہیں۔ وہ ہر سوراخ سے کارخانے میں بنتی ہوئی ہر چیز سے جھانکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

کرن سنگھ کا کارخانہ قلب شہر سے قریب گھنے درختوں سے گھرے ایک میدان میں تھا۔ بڑے سے ٹین کے ڈھالئے میں وہ چیزیں جمادی جاتیں جو تیار تو ہو چکتیں لیکن جن پر ابھی روغن نہ چڑھایا جاتا وہ داہنی جانب شوروم میں سجادی جاتیں جہاں خریدار معائنہ اسباب کرتے۔ کرن سنگھ کا اجلاس یعنی میز" اس کا فون" اس کے کاغذات غرضکہ اس کی نشست ایسی جگہ تھی کہ وہ آنکھ اٹھا کر سارے کارخانے پر بہ یک نظر اپنا حکم چلا سکتا تھا ــــــ اور واقعی کرن سنگھ کی آنکھیں تھیں بھی بڑی تیز ــــ ایسا لگتا تھا کہ ضرورت سے زیادہ دیکھتی ہیں۔ سارے کاریگر یہی کچھ سمجھتے تھے۔

جانے کیا بات تھی کہ کرن سنگھ ہنستا ہوا بڑا معصوم لگتا تھا۔ سنجیدگی کے لئے اس کا چہرہ سچ پوچھیے تو بنا ہی نہ تھا لیکن کاریگروں پر حکومت کرنے کی اس نے جو عادت ڈال لی تھی وہ اسے کھل کر ہنسنے نہ دیتی تھی ــــ اور اس طرح وہ اپنے پر سنجیدگی کا ملمع چڑھائے رکھتا تھا لیکن کاریگروں سے دور اپنی میز پر بیٹھا جب یاروں دوستوں سے ہنستا تو اس ڈیل ڈول اور بارعب چہرے کے باوجود کچھ بچہ بچہ سا

لگتا تھا۔ ایسا بچہ جو ہمجولیوں میں اسکول کا ماسٹر بنکر رعب گانٹھ رہا ہو۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے بلڈ پریشر اور شکر کی بیماری نے اس کی مسکراہٹوں کو اپنے تصرف میں لے لیا تھا۔ کرن سنگھ کچھ کھویا کھویا رہتا۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ ادھیڑ عمر کے کرن سنگھ میں چھپا ہوا بچہ ان دنوں تیزی سے بوڑھا ہو رہا ہے اور کرن سنگھ جوں کا توں ہے۔

ویسے کرن سنگھ کو ان لوگوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا جو وعدہ کر کے وفا نہیں کرتے تھے۔ اور جب سے اس کی صحت خراب ہوئی تھی چھوٹی چھوٹی بات بھی اسے اکھرنے لگی تھی ـــــ وہ صبح دوپہر شام نئی نئی قسم کی گولیاں کھاتا رہتا ـــــ انسولین کے انجکشن خود ہی لگا لیتا۔ شہر میں کئی نامی ڈاکٹر تھے قلب کے ماہر معالج تھے۔ لیکن کرن سنگھ کی وضعداری نے اس کو ڈاکٹر سیتل سنگھ ہی کے زیر علاج رکھا جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔ کسی نے کچھ کہا بھی کہ فلاں ماہر قلب کو بتلاؤ تو کرن سنگھ ٹال گیا۔ اپنی کراری آواز میں وہ کہتا ـــــ پیٹنٹ دواؤں کی اس دوڑ میں سارے ڈاکٹر کدم بہ کدم (قدم بہ قدم) چلتے ہیں کسی میں آگے جانے کا یارا ہی نہیں ہے۔ کوئی ماہر کلب (قلب) کیا تیر مارے گا بھلا۔ پھر سیتل کی محبت میرا آدھا مرض کم کر دیتی ہے۔ دن میں دو تین بار تو وہ مجھ سے مل جاتا ہے۔ تمہارے شہر میں کوئی ڈاکٹر ہے جو میرے یہ سب چونچلے برداشت کر لے" ـــــ اگر کہنے والے سے بے تکلفی ہوتی تو کرن سنگھ کہتا۔

"ابے چھوڑ یا جروا دے مزدوراں سب ڈاکٹر ایک سمان ہیں۔ کھیل صرف سانس کی ڈور کا ہے اور یہ ڈور ٹوٹی تو سمجھو کر پتنگ گیا ہاتھ سے پھر سب ہی

نہ دیکھتے رہیں گے چھوٹا ہو۔ بڑا ہو"۔

کرن سنگھ کی کسی دبتی تھی تو بس پورن سنگھ کی ماں سے۔ پورن سنگھ کی ماں کرن سنگھ کی گھر والی ہے اور پورن سنگھ اکلوتا بیٹا۔

سردارنی بھی مگر کرن سنگھ کا طنطنہ جانتی تھی۔ جب وہ اپنی بات پر آتا تو پھر سردارنی بھی چپکے سے کھسک جاتی لیکن زیادہ تر کرن سنگھ ہی ہار مان لیتا اور میدان سردارنی کے ہاتھ رہتا ـــــ وہ کہتا کہ پورن سنگھ کی ماں سے ہارنے میں مزہ ہے جیتنے کو جی نہیں چاہتا لیکن ڈاکٹر سنیل کے معاملے میں کرن سنگھ کا جی نہیں چاہا کہ پورن کی ماں سے ہار دے۔ اور اس طرح سردارنی چپ ہو رہی۔

کرن سنگھ نے پورن سنگھ کو کبھی پورن نہیں پکارا ویسے وہ پورن سنگھ پر جان چھڑکتا تھا ـــــ اپنی اس سخت گیری کے لئے وہ کہتا کہ آج کا دور پیار کا متحمل نہیں ہے ـــــ میرا پیار پورن سنگھ کے مِتکبل (مستقبل) کو کیا دے سکتا ہے۔ میری سختی ہی اس کو ترکی (ترقی) کے راستے پر چلا سکتی ہے ـــــ ورنہ کیا میں باپ نہیں ہوں یا ـــــ (یہ یا دراصل یار کا مخفف ہے۔ وہ رے اڑا کر صرف یا کہتا۔)

اور سچ پوچھیے تو کرن سنگھ باپ ہی نہیں ماں بھی تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے کرن سنگھ ذرا ذرا میں ہانپنے لگا تھا۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوتی اور وہ غصے میں آجاتا تو اس کا تنفس بڑھ جاتا۔

کاریگر جانتے تھے کہ ڈاکٹر نے زیادہ کام کرنے سے کرن سنگھ کو منع کیا ہے۔ یہ بھی ہدایت کی ہے کہ وہ غصہ نہ کرے ـــ جتنا بن پڑے خوش رہے۔ ہنسے اور غم نہ کرے۔

کرن سنگھ اپنے معالج سے کہتا ——— گھبراؤ نہیں سیتل میں یہاں مروں گا نہیں۔ جب مرنا ہو گا چپکا سا لاہور پہنچ جاؤں گا ——— ماں تو پھر نہیں لوٹوں گا میں۔"
یہ بات کرن سنگھ بڑے اعتماد سے کہتا ——— اس کی زبان سے لاہور کی بات سن کر یوں معلوم ہوتا کہ کرن سنگھ واقعی یہاں نہیں مر سکتا۔ اس لئے کہ اس کا دل یہاں نہیں لاہور ہی میں دھڑک رہا ہے۔

کچھ دیر تک وہ دور دور دیکھتا۔ ایسی نظروں سے جو کاریگر جانتے تھے کہ ہر رکاوٹ کو پرے ڈھکیل کر بھی دیکھ سکتی ہیں۔

شیخو اب کرن سنگھ سے اتنا خائف نہیں رہا تھا ——— وہ اس کے سامنے آتا اس سے بات چیت بھی کر لیتا ——— اور کرن سنگھ کسی بات پر کھل کر ہنستا تو شیخو مسکرا بھی لیتا۔

لیکن جمالے نے جب کبھی شیخو کے جسم سے اپنی آغوش بھر لینا چاہی شیخو نے پکارا ———

"وہ دیکھو مالک دیکھ رہا ہے ———" اور جمالے نے محسوس کیا کہ واقعی ایک بار خدا انہیں دیکھے گا لیکن کرن سنگھ دیکھ لے گا۔ اور اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی کہ شیخو نکل بھاگا۔ پھر کالی کالی جامنیں، آئس فروٹ، بارکس کے جام یا بے نشان آم شیخو کے ہاتھ میں ہوتے۔ وہ بڑا چھوڑا تھا۔ محبت سے جمالے اسے چکی چکی پکارنے لگا تھا۔

ایک دن کرن سنگھ نے شیخو سے کہا۔ سامنے والی بلندی پر جو دفتر ہے وہاں جائے اور شاعر کو بلا لائے ——— کہنا کہ مالک بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم نہیں آؤ گے

تو خود چلا آؤں گا۔

شیخو دفتر پہنچ کر ایک ایک سے شاعر کو پوچھتا پھرا۔ آخر کو مایوس لوٹ کر اس نے کرن سنگھ کو بتایا کہ جس دفتر کو وہ بھیجا گیا تھا وہاں شاعر نام کا کوئی آدمی کام ہی نہیں کرتا۔

کرن سنگھ بگڑا — " ابے جروا دے مزدوراں کسی کردوں یا تری۔ اس کا نام تو اور کچھ اور ہے پر وہ شاعری کرے ہے — گورا گلٹا — چند واصاف بیچھے کو لمبے سے بال، سنہری چشمہ لگائے بڑا دولت مند لگتا ہے لیکن چھ ماہ سے بک شلف کے پیسے نہیں دیئے۔ ہر پہلی کو دوسری پر ٹال دیتا ہے۔"

شیخو ایک دم اچھل پڑا — "اوئے" اس نے انجانے میں سرداری کے لہجے میں کہہ دیا — پھر سنبھل کر کہنے لگا۔ پہچان گیا۔ پہچان گیا — اسی نے تو مجھ سے کہا کہ شاعر وائر یہاں کوئی نہیں ہے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے — اور شیخو پلٹ کر پھر چمپت ہونے لگا۔

کہاں چلا" یا — سردار چلایا۔

لے آؤں مالک اسے پکڑ کے — اور شیخو پھر نہیں رکا۔

شیخو لوٹا تب بھی کوئی شاعر وائر تو اس کے ساتھ نہیں تھا۔ البتہ وہ اطمینان سے چکی پہ چکی چبا رہا تھا اور اس کی جیب اتنی پھولی ہوئی تھی کہ پھٹ سکتی تھی۔

اس نے کرن سنگھ کو بتایا کہ اب وہ آدمی وہاں نہیں ہے جو ہو بہو ویسا ہی تھا جیسے اس نے بتلایا تھا۔

کرن سنگھ جان گیا کہ شیخو وصولی کرنے والوں کی چال سیکھ گیا ہے۔ اس نے شاعر سے کچھ پیسے بٹور لئے ہیں اور اب باور کروا رہا ہے کہ وہ نہیں ہے۔

کرن سنگھ کا پارہ چڑھا ـــــ اس نے جھٹ سے شیخو کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی طرف گھسیٹا ـــ ایک چپت لگا کر کہنے لگا۔

"ابے وہ جرواد سے مزدوراں ای شاعر تو اب تیری جیب میں ہے تیرے منہ میں اب وہی تو چٹخارہ بن گیا ہے یا جی ـــ یہ پیسے تو اسی سے لے آیا ہے۔ کیوں ہے نا، ہے نا ـــ"

اور شیخو سر سہلا سہلا کر بسورنے لگا

لیکن سردار جی اتنے ہی میں ہانپنے لگا تھا ـــ وہ ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ اس کو شاعر آتا ہوا دکھائی دیا ـــــ وہ اس کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"جی چاہتا ہے تلوار نکال کر تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔"

شاعر کو پورن سنگھ سے معلوم ہو گیا تھا کہ کرن سنگھ ان دنوں بیمار ہے۔ ڈاکٹروں نے غصّہ نہ کرنے کی اور آرام لینے کی ہدایت کی ہے ــــ اس نے جب اس کو ہانپتا ہوا دیکھا تو مسکراتے ہوئے بڑھ کر کرن سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ معانقہ کر کے اس کو نارمل کر سکے۔

لیکن کرن سنگھ پیچھے ہٹ گیا۔

"سرداراں اب غصّہ تھوک بھی دے یار" ـــــ شاعر نے سرداروں ہی کے پنجابی لہجے میں کہا ـــــ "لے میں آگیا ہوں۔ دل ٹھنڈا کر لے مگر ذرا دھیرج سے تجھے تاؤ نہیں کھانا چاہیئے سردار ـــ پورن نے مجھے بتایا تھا کہ تیرا جی ٹھیک نہیں ان دنوں ـــ"

"تو چاہتا ہے تھا کہ مر کھپ جاؤں ــــ قصہ پاک ہو تو تجھے آنند ملے کہ

اب کون مائی کا لال وصول کرے گا۔"

شاعر نے یہ بات سُنی تو منٹ بھر کو چُپ ہو گیا ــــ پھر اُس نے بڑے دکھ سے کہا ــــ

"سردارا! یوں کہنے سے اچھا تھا کہ تلوار اٹھا کر میرے ٹکڑے کر دیتا ــــ بھائی ــــ کیا تو کوئی بے اولاد ہے ــــ وہ جو تیرا پتر ہے پورن کیا وہ میرا گریبان پکڑ کر تیرا قرض نہیں چکائے گا پھر میں کس طرح تیری رقم بچا سکوں گا۔ کاش تو نے یہ بات نہیں کہی ہوتی یا ــــ اور کیا ــــ اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ پیسے کے لئے میں یہ چاہوں گا کہ تو مر جائے ــــ وہ بھی اس قدر حقیر اور ادنیٰ رقم کے لئے؟"

کچھ اس ڈھنگ سے شاعر نے یہ بات کی کہ کرن سنگھ کا پارہ اتر گیا اور اس کا دل موم بن گیا۔

"مجھے پیاس لگی ہے" شاعر کہنے لگا ــــ "ٹھنڈا سا پانی منگوا دے اور اگر جی چاہے تو اس میں زہر ڈلوا دے اپنے ہی ہاتھوں اپنا کام تمام کر لوں گا۔ تو کیوں تلوار کھینچنے کی زحمت اٹھائے۔"

اب کرن سنگھ مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں شاعر کا ہاتھ تھام لیا۔ "تیری یہی باتیں تو میرا پارہ اتار دیتی ہیں۔"

"کیا خاک اتارتی ہیں۔ تو نے زبان سے جو گھاؤ لگائے ہیں کیا وہ تیری تلوار کی کاٹ سے کم ہیں۔"

"ارے چھوڑ یار ــــ غصّہ تھا بک گیا ہوں۔ تو لے لے انتکام (انتقام) کہہ لے مجھے بُرا بھلا کر لے گالی گلوچ۔"

دونوں ہنس پڑے۔

سردار ہنستے ہنستے کہنے لگا — "یا تو واکھی (واقعی) جادوگری کرے ہے۔ کہاں تو میں نے تجھے کتل (قتل) کردیا تھا۔ اور اب الٹے تجھی سے کئے ریاوں گا لی گلوچ دے ہے"

"نہیں سداراں۔ میں قصوروار ہوں بھائی۔ آج رات ریڈیو پر پروگرام ہے۔ پرسوں چک بھناؤں گا اور تیرے پیسے حاضر کردوں گا" شاعر کہنے لگا۔

"کل تو نے ریڈیو پر شاعری کرتا ہے؟"

"نہیں سداراں میں شاعر نہیں ہوں۔ کہانی کار ہوں۔ کہانی سناؤں گا ٹھیک دس بجے رات — سنو گے تم؟"

"ضرور سنوں گا، آج تک میں تجھے شاعر ہی سمجھتا تھا لیکن تو نکلا کہانی کار، کہانی میرے جنم جنم کی ساتھی ہے۔ میں ضرور سنوں گا یا"

دوسرے دن جب وہ پیسے لے کر کارخانے پہنچا تو کرن سنگھ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"میں نے جھوٹ نہیں کہا یا — تیری کہانی نے دل مسل کر رکھ دیا۔ کیا کیا جتن کئے ہیں تب کہیں آنسو چھپا سکا ہوں اپنی عورت سے ورنہ وہ پوچھ بیٹھتی سردار تم رو رہے ہو۔ کیا تم اپنی ماں کے پتر نہیں ہو — میں اسے بھلا کیا بتا سکتا تھا بھائی کہ مجھے اپنی بیماری کی فکر نہیں ہے۔ لیکن چاندنی رات میں راوی کے سینے پر ڈولتے ہوئے بجرے میں کوئی بیٹھا ماہیا گا رہا ہے۔ پانی کے ٹکڑوں میں چاند کا عکس ٹوٹ کر گھل رہا ہے اور میں گانے والے سے کہہ رہا ہوں ہیر رانجھا چھیڑ نا، ویر جوان اور جب وہ ہیر رانجھا

چھیڑتا ہے تو اس کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچتی ہے۔ میں ذات پات کے ملک اور سرحد کے بندھن توڑ کر کیا اس راوی تک پہنچ سکوں گا۔ جس کے ایک کنارے پر میں سنے بجرے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی رشیاں سے کہا تھا کہ اسی کنارے پر تیرا انتظار کروں گا۔"

"تو پھر تم نے انتظار کیا ہوتا سداراں۔"

"شاعر ـــ یا ـــ میں تو آخری سکھ تھا جس نے لہور چھوڑا ـــ پر وہ نہیں آئی" اس نے پاکستان میں رہنا تھا۔"

پھر کرن سنگھ اور شاعر دونوں ہی خاموش ہو گئے۔

لیکن کرن سنگھ یکایک ہنس پڑا ـــ "لو میں تجھے شاعر کہہ کر پکار رہا ہوں پر کیا بُرا ہے" ـــ وہ خود ہی کہنے لگا ـــ "بات ایک ہی ہے ـ میں تجھے یہی پکاروں گا ـــ"

جب شاعر نے پون سو روپے سداراں کے ہاتھ پر رکھ دئیے تو اس نے پوچھا۔
ـــ "تجھے اس کہانی کا ریڈیو نے کیا دیا؟"

"یہی جواب میں تمہیں دے رہا ہوں۔"

"بس؟ ـــ تو پھر لے ـــ اس نے دس روپے شاعر کو لوٹاتے ہوئے کہا" "یہ کچھ تو بھی تو رکھ لے، مجھے پھر دے دینا۔ جب تجھ سے بن پڑے ـ کوئی تاریخ کی کید (قید) نہیں ہے"

جب شاعر جانے لگا تو اس نے کہا ـــ "او ئے شاعراں ـــ کبھی کہانی مجھ پر بھی لکھنا بھائی۔"

**ایک** دن شیخو کارخانے کے قریب سے گذر رہا تھا تو چکی چکی بیچنے والے اس کے ایک ہم عمر ساتھی نے پکارا۔

"کیا بات ہے شیخو، کیا کارخانے کی نوکری نہیں کر رہا ؟"

ہاں رے شیخو نے بڑی راز داری سے کہا ۔ مالک بیمار رہے اور وہ جو جمالے ہے نا ؟ وہ برا آدمی ہے ۔ وہ مجھے بہت تنگ کرنے لگا تھا ۔ مالک اچھا تھا۔ تب تو میں اسے چپل دے کر نکل جاتا تھا کہ دیکھو ۔ مالک دیکھ رہا ہے ۔ اور مالک کے نام سے جمالے کی نانی مرتی تھی ۔ اب مالک بستر کا ہو کر رہ گیا ہے ۔ کتنے ہی دن سے راونڈ پر نہیں نکلا تو جمالے کے حوصلے بڑھ رہے تھے۔"

"وہ چاہتا کیا ہے آخر ؟"

ارے تو بھی بڑا بھولا ہے ۔ اور شیخو نے بڑی راز داری سے جھک کر کچھ کہا ۔

"باپ رے" چکی چکی والے لڑکے نے کہا اور دونوں مل کر خوب ہنسے۔

جب تک کرن سنگھ فریش رہا جمالے کے خوف سے شیخو نے کارخانے کا رخ ہی نہیں کیا ۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ کرن سنگھ اب آہستہ آہستہ باہر نکل کر اجلاس پر بیٹھنے لگا ہے ۔ البتہ زیادہ گھومنے پھرنے اور کارخانے کا چکر لگانے کی ابھی اسے ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی ہے تو شیخو بھی ایک روز چپکے سے کارخانے جا پہنچا ۔ یوں تو وہ چاہتا تھا کہ دس پندرہ دن اور انتظار کرے تاکہ مالک بھلا چنگا ہو جائے لیکن اب اس کے کھانے کے لالے پڑنے لگے تھے ۔ دن میں کبھی ایک آدھ بار اسے کھانے کو مل جاتا تو

بھی غنیمت تھا ــــــ وہ اس قدر سرپھرا بھی تھا کہ دو ہوٹلوں میں میزوں کی صفائی کی نوکری اس نے کھڑے کھڑے اس لئے چھوڑ دی تھی کہ مالک اور بیروں نے اسے ماں اور بہن کی گالی دی تھی۔

شیخو کارخانے میں گھس کر سیدھے اجلاس تک جا پہنچا۔ کاریگروں نے کام چھوڑ کر اسے اجلاس کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ــــــ جمالے کی آنکھوں میں شیخو کو دیکھ کر چمک سی آ گئی۔

لیکن جب وہ اجلاس پر پہنچا تو وہاں کرن سنگھ کی بجائے پورن سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ شیخو سمجھ گیا کہ مالک ابھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ اس کی صحت یابی کی خبر اس نے غلط سن رکھی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے چپکا سا کھڑا رہا تھا۔

پورن سنگھ نے شیخو سے پوچھا کدھر آئے ہو۔

"مالک کہاں ہے؟

"اب یہاں کوئی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں پھر ملازمت مل سکے"۔

شیخو کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی ــــــ لیکن اس نے خود کو سنبھالا ــــــ "میں مالک سے ملنا چاہتا ہوں"۔

پورن سنگھ نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا منشی جی پاس ہی سے نکل آئے جو شیخو کی باتیں سن رہے تھے۔ انھوں نے شیخو کو آواز دے کر بلایا۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو منشی جی نے کہا۔

"مالک کو مرے آج چوتھا دن ہے شیخو ــــــ تین روز سے کارخانہ بند تھا آج کھلا ہے"۔

شیخو کا جی چاہا کہ داڑھی کا خیال کئے بغیر مولوی صاحب کا منہ توڑ دے جو ایسی بات زبان سے نکال رہے ہیں ــــ پھر اس نے خود کو ملامت کی۔ یہ نوکری سے مایوسی کا غصہ تو نہیں ہے لیکن جب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں چپ چاپ کھڑا رہا۔

"وہ تو صحت مند ہو چکے تھے منشی جی۔" اتنا کہتے کہتے شیخو کی آواز بھر آئی تھی۔

"ہاں ــ" منشی جی کہنے لگے ــ "انھوں نے کام بھی سنبھال لیا تھا۔ جس وقت مرے ہیں اس سے کچھ دیر قبل اچھے بھلے تھے۔ ایک گاہک نے آرڈر دے کر شادی کیلئے جہیز منگوائی تھی۔ صحت کی خرابی کے باوجود انھوں نے اپنی نگرانی میں دلہن کا وہ پلنگ تیار کروایا لیکن وہ صاحب وقت پر نہیں آئے یہاں تک کہ وہ تاریخ بھی ٹل گئی جس دن انھوں نے بتلایا تھا کہ اس دن شادی ہے ــــ جب وہ آئے تو مالک سے ان کی تکرار ہو گئی ــــ تو تو جانتا ہے نا ــــ وہ جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے والوں سے بہت چڑتے تھے ــــ یہ برہمی ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی ــــ سینے میں درد ہوا، اور اجلاس پہ بیٹھے ہی تھے کہ انتقال کر گئے ــ"

شیخو بلک بلک کر رونے لگا ــــ پھر آنسو پونچھ کر جب وہ جانے لگا تو نئے مالک نے اسے بلایا۔

"تم چاہو تو کل سے نوکری پر آ سکتے ہو ــ" پورن سنگھ نے دل گیر ہو کر کہا۔

شیخو کچھ دیر گم سم خاموش کھڑا رہا ــ پھر اس نے کہا ــــ

"مجھے اب نوکری نہیں کرنی ہے مالک۔" اور گردن جھکائے وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر لوٹنے لگا — سبھوں نے اس کو جاتے ہوئے پھر ایک بار دیکھا — لیکن اب وہ کارخانے سے باہر جا رہا تھا۔ کرن سنگھ فرنیچر میکر کے اس کارخانے سے باہر جو سایہ دار درختوں کی گھنی چھاؤں سے گھرا ہوا تھا اور جس کے باہر بھی اتنی ہی کڑی دھوپ تھی جتنی اندر۔

# انکشاف

**لوگوں** نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے۔

ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گیتار بجانے والا جانڈس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا۔ لیکن لوگ اس کو جانڈس ہی پکارتے تھے۔

اینگلو انڈینس کی چھوٹی سی کالونی میں تقاریب کے موقع پر ڈیوس گیتار بجاتا تھا۔

چاندنی راتوں میں قلعے کی فصیل سے باہر ندی کے پُل پر نوجوانوں کی جو بھی ٹولی نظر آتی اس میں خان صاحب اور ڈیوس دونوں ہی کی شمولیت یقینی ہوتی اور ڈیوس کے گیتار پر خان جھوم جھوم جاتا۔

ڈیوس نے انجیلِ مقدس کی یہ عبارت سُنائی جو اسے ازبر تھی اور لوگ خاموشی سے سُننے لگے۔

"قانائی گلیل میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی ۔ اور
یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی اس شادی میں دعوت تھی۔
اور جب مے ہو چکی تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس
مے نہیں رہی ۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت
تجھے مجھ سے کیا کام ہے؟ ابھی میرا وقت نہیں آیا ۔ اس کی ماں
نے خادموں سے کہا ۔ جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو ۔ وہاں
یہودیوں کی طہارت کے دستور کے مطابق پتھر کے چھ مٹکے رکھے
تھے ۔ اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی ۔ یسوع نے
ان سے کہا مٹکوں میں پانی بھر دو ۔ پس انھوں نے ان کو
لبالب بھر دیا ۔ پھر اس نے ان سے کہا اب نکال کر میر مجلس
کے پاس لے جاؤ ۔ پس وہ لے گئے ۔ جب میر مجلس نے وہ
پانی چکھا تو مے بن گیا تھا ۔"

ڈیوس نے یہ کہہ کر لوگوں کی طرف دیکھا ـــــ سب کے سب اسی کا منہ
تک رہے تھے ۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی اور نئی بات کا انکشاف کرنے والا
ہے ـــ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی ۔ اور کہنے لگا ۔
"یوحنا رسول کی معرفت لکھی گئی انجیلِ مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد
کرے گا ۔"

میری طرح شاید بھی لوگ جانتے تھے کہ خان کو کیوں گرفتار کیا جا سکتا ہے ۔
اسی لئے کسی نے کچھ نہ پوچھا اور ان میں سے کتنے ہی تھے جنھیں یہ بات معلوم ہوئی تھی ۔
لیکن اس پر بھی کسی نے کچھ نہ پوچھا ۔

ڈیوس میں کر بہت قریب ہو گیا ـــــ کہنے لگا سردار رنجیت سنگھ سے خان نے کہا تھا ـــــ

تمہاری رات اُجالوں سے منور رہو گی اور تمہارے قہقہے سناٹوں کا سینہ شق کریں گے " اور تمہیں شادی کی تقریب میں میرے جیتے جی ایک بوند شراب کی کمی محسوس نہ ہو گی - لیکن وہ گوشت نہیں کھاؤں گا - جس سے تم تقریب میں تواضع کرو گے - میرے لئے ذبح کئے ہوئے دنبے کے گوشت کا علیحدہ انتظام کرنا ہو گا -

اور سردار رنجیت سنگھ نے خان کے لئے مسلخ تک آ کر خود ہی گوشت خریدا تھا اور اس نے کسی دوسرے سردار پر بھروسہ تک نہ کیا تھا کہ کوئی خان کے آگے کہیں جھٹکے کا گوشت نہ پیش کر دے ـــــ اور یقیناً سردار رنجیت سنگھ نے خان کے لئے اپنی نگرانی میں تلن کروا دیا ہو گا - اور اس کا منتظر ہو گا - لیکن اب خان وہاں نہیں جا سکتا اس لئے کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے -

اس ضلع کے " خشک " قرار دیئے جانے سے پہلے خان کی وجاہت کے ساتھ ساتھ اس کی وردی کا بانکپن بھی نہ صرف سارے صوبے میں مشہور تھا بلکہ جمادار میں بھی اس کی بات ہوتی تھی ـــــ خاکی رنگ کی کلف چڑھی وردی زیب تن کئے جب خان بستی سے نکلتا تو آس پاس کے لوگ وردی کی کھڑ کھڑاہٹ سے خان کی آمد کا پتہ چلا لیتے ـــــ چمڑے کا بلٹ جس سے خان کی کمر کسی رہتی تھی - خان نے بڑے اہتمام سے دھرمولیدروکس میں مشین پر سلوایا تھا ـــــ رم، برانڈی اور وہسکی کے نپ کندھے کے سہارے سینے پر لگے ہوئے ترچھے بلٹ میں وہ اس طرح کھونس لیتا جیسے تمغے سجا رکھے ہوں - یہ بلٹ بھی چمڑے کا تھا جس کو خان نے اپنی نگرانی

یں دھرمونیڈورکس ہی میں بنوایا تھا ــــــ کمر کی بلٹ میں سوڈے کے شیشے لگے رہتے ــــــ کمر کی بلٹ اور سینے کی بلٹ جہاں ایک دوسرے سے ملتے تھے وہاں ایک چھوٹا سا چمڑے کا بکس ٹنگا رہتا۔ جس میں ابلے ہوئے دس بارہ انڈے رکھے جاتے تھے ــــــ کسی اسنو کی خالی شیشی میں پسا ہوا نمک اور کالی مرچ بھی بھرے رہتے ــــــ خان اس طرح ضلع کا چلتا پھرتا میخانہ تھا۔

چاندنی راتوں میں فصیل کے باہر ندی کے پل پر جب ڈیوس کا گیتار اس کے ساتھیوں کو مسحور کر دیتا۔ تو خان کو اپنے مال کے اچھے دام وصول ہو جاتے۔

جو بھی اس سے کہتا "ساقیا" کہ وہ اس کی طرف بڑھتا ــــــ سینے کے بلٹ سے ایک تمغہ کم ہو جاتا اور خان نپ کا ڈھکن چٹخا کر کھول دیتا۔ پھر کمر سے گلاس نکال کر آدھا ایک یا پورا پگ آرڈر کے مطابق گلاس میں ڈال دیتا۔ پھر بلٹ کی ہک سے سوڈے کی کنجی نکال کر اس طرح سوڈا کھولتا کہ گیتار کے سروں میں سوڈا باٹل کے کھلنے کی آواز مل کر مزا دے جاتی ــــــ ہاتھ بڑھا کر جب کوئی رند گلاس اس کے ہاتھ سے لیتا تو خان کی انگلیاں ابلے ہوئے انڈے کو بڑے پھرتی سے چھلکے سے جدا کر دیتیں اور پل کے نیچے ندی کے شفاف پانی میں چاند کے عکس سے دور سفید چھلکے تیرنے لگتے۔

پل کے اوپر بعض منچلے نوجوان ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ناچنے لگتے ــــــ یہ الٹا سیدھا ناچ صرف ان کے دلوں کی ترنگ اور خان کے مے خانے کے اثر کی غمازی کرتا ــــــ جب خان کے پاس مے ختم ہونے لگتی یا یوں کہیئے کہ یہ چلتا پھرتا مے خانہ خالی ہونے لگتا تو خان۔ آخری پگ ڈیوس کی طرف بطور تحفہ پیش

کرتا۔ یہ گویا اُس کے فن کی قدر دانی ہوتی۔

لیکن جب یہ ضلع "خشک" قرار دیا گیا تو ندی کے پل پر جمنے والی محفلیں جیسے یک لخت اجڑ گئیں۔

خان کے لئے بڑی مشکل آ پڑی تھی ـــــ وہ شئے جو اس کی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔ وہ پہناوا جو اس کی انفرادیت بن گیا تھا وہی یک لخت اُسے ترک کر دینا تھا۔ ویسے خان کے کاروبار میں مے فروشی کا بھی ایک حصّہ تھا لیکن اس کو اپنے کاروبار کے ترک کرنے سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی وردی کے تمغے چھن گئے تھے۔ اور اب بغیر اس سامان کے اس کی وردی میں کوئی دلکشی نہیں رہی تھی ـــــ وہ دو دن تک گھر سے نہ نکلا۔ لوگ بے چین تھے کہ خان کو دیکھیں ـــــ دو ایک جو قریبی دوست تھے وہ اس کے گھر پر پہنچے۔ لیکن اس کی بیوی نے اندر ہی سے جواب دے دیا کہ خان گھر پر نہیں ہے۔ نامراد دوست واپس ہوئے تو انھوں نے دوسروں کو بتلایا کہ خان گھر پر رہ کر بھی ملنے سے گریز کر رہا ہے ـــــ تیسرا دن بھی یوں ہی گذر گیا اور خان بستی میں نظر نہ آیا۔

دودھ گھر کی سرسوتی بائی کو سب سے زیادہ فکر لاحق تھی ـــــ روزانہ پاؤ سیر دودھ اور پاؤ بھر دہی صبح سویرے وہ بائی کی دوکان ہی پر کھڑا غٹار جاتا تھا ـــــ تین دن سے اس کے نہ آنے کی وجہ سے بائی جی کو نقصان ہو رہا تھا۔

ڈیوس سب سے زیادہ بے کل تھا ـــــ چاندنی راتیں قریب آ رہی تھیں۔ ایک رات گذرتی تو دوسری رات زیادہ اُجالے اپنے جلو میں لے کر چلی آتی ـــــ دمکتا ہوا چاند ہر شب ندی کے پانی میں نہانے کے لئے اترتا۔ اور

اس کا نکھڑا زیادہ ہی نکھر آتا ـــــ خان کے دوستوں کی ٹولی دو ایک بار سرِ شام فصیل کے باہر ندی کے پُل پر گئی بھی لیکن جلد ہی لوٹ آئی کیونکہ ڈیوس نے اپنی گیتار بھی ساتھ نہیں رکھی تھی۔

ڈیوس نے دل ہی دل میں سوچا ـــــ میں جاؤں گا تو خان ضرور مجھ سے ملے گا۔

اور رات گئے عام راستے سے ہٹ کر وہ چکر کاٹتا ہوا خان کے گھر پہنچا کیونکہ درمیان میں وہ ایک دوسرے دوستوں کے گھر بھی ملتے تھے اور ڈیوس چاہتا تھا کہ وہ تنہا خان سے ملے۔

خان کی بیوی نے جب ڈیوس کا نام سُنا تو اس کو باہر ہی روک کر وہ دروازے تک چلی آئی ـــــ اس نے بتایا کہ خان ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔ وہسکی کی بوتل بھی اس کے ساتھ ہے اس نے بہت منع بھی کیا لیکن خان نہیں مانا۔ وہ ڈر رہی ہے کہ خان گرفتار نہ ہو جائے۔

ڈیوس لمحہ بھر کو خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا" خداوند یسوع اس کی مدد کرے گا۔ خدا کا بیٹا جس نے جنم کے اندھے کو آنکھیں عطا کیں۔"

اور ڈیوس روانہ ہو گیا ـــــ اس نے بستی کا چکر کاٹ کر فصیل کے باہر پچھم کی اور سے ندی کا رُخ کیا ـــــ اس کو خیال گذرا کہ خان یقیناً پُل پر ہو گا اور تنہا بیٹھا مے سے جی بہلا رہا ہو گا۔

ڈیوس لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جب پل پر نمودار ہوا تو خان نے ذرا سا پس و پیش کر کے اسے پہچان لیا ـــــ ایک ثانیئے کے لئے خوف کی پرچھائیں

خان کے دل سے ہو کر گذر گئیں لیکن اس نے ندی کے پانی میں پتھر پھینک کر چاند کے عکس کو درہم برہم کر دیا اور ڈیوس کو یہ جتلانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت بھی نہیں ڈرا تھا جب کہ اس نے ڈیوس کو نہیں پہچانا تھا۔

خان نے گلاس بھر کر ڈیوس کی طرف بڑھایا۔

لیکن ڈیوس نے ہاتھ بڑھانے میں بہت دیر کی۔

"ڈرتے ہو" ؟ خان نے پوچھا۔

"ہاں ڈرتا ہوں ـــــ اس لئے کہ تم اگر اسی راستے پر چلتے رہو تو ملنے جلنے والے تم سے کٹ جائیں گے ـــــ تمہارے دوست تمہیں پہچان کر بھی نہیں پہچانیں گے ـــــ اور ـــــ اور اسطرح ہم ایک دوسرے کو کھو دیں گے"۔

"کیا تم ابھی ابھی انجیل پڑھ کر آرہے ہو ـــــ تم انجیل مقدس کی باتیں بھی کچھ اسی ڈھب سے کرتے ہو جیسے اس وقت مجھ سے کلام کر رہے ہو ـــــ" خان یہ کہہ کر ڈیوس کو تیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

ڈیوس نے ایک ہی ٹانچ میں سارا گلاس خالی کر دیا ـــــ "مے کی قسم میرے بیٹے کا بپتسمہ نہ ہو اگر تمہیں اس راستے سے ہٹا نہ لوں"۔

"کیا کہتے ہو" ـــــ خان بپھر گیا۔

"یسوع کا کوئی پیرو ایسی بات نہیں کرتا جو میں نے کی ہے۔

خان لیکن چوکا نہیں ـــــ" اور بات تم نے اس لئے کی کہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے"۔

"اور جو ہوتا بھی تو میں یہی بات کرتا ـــــ" ڈیوس نے کہا۔

"لیکن میں کل تک بُرا نہ تھا ــــــ آج کیوں اتنا بُرا ہو گیا ہوں کہ تم مجھے دوستوں کے کفارہ کرنے سے ڈراتے ہو؟"

"تم بُرے نہیں ہو ــــــ میں نے کب کہا کہ تم بُرے ہو گئے ہو ــــــ لیکن تمہیں یہ زمین چھوڑ دینی ہو گی، جس کی مٹی سے تم بنے ہو یا پھر یہ راستہ چھوڑ دینا ہو گا جس پر تم چل پڑے ہو اور جو اس زمین پر دور تک نہیں جا سکتا۔

"میں سوچ رہا ہوں ــــــ خان نے کہا کہ" یہ زمین چھوڑ دوں گا"

لیکن یہ وردی نہیں چھوڑو گے جو تم آج بھی پہنے ہوئے ہو اور جس میں آج بھی وہسکی اور رم کی بوتلیں تم نے لگا رکھی ہیں۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں ــــــ یہ وردی میرا اصلی روپ ہے۔ میں اپنے اس پہناوے کو چھوڑ کر خود کو ننگا محسوس کرتا ہوں اور بستی میں نکلتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"میرا ایک بھائی ہے۔ بہت قریب کے ضلع میں جہاں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"اور ہم سب تمہارے کوئی نہیں ہیں ــــــ یہ ندی، یہ ندی میں نہاتا ہوا چاند تمہارا نہیں ہے ــــــ وہ قہقہے جو اس وقت تمہارے اطراف نہیں ہیں۔ لیکن کل تمہارا پیچھا کرنے والے ہیں کیا وہ بھی تمہارے نہیں ہیں ــ میرا گیتا رجسے میں نے تمہاری روپوشی کے بعد چھوا تک نہیں ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے ــــــ تم یہ زمین آسانی سے چھوڑ سکو گے؟ ــــ تم سمجھتے ہو کہ جب تم جانے لگو گے

تو یہ زمین تمہارے پیر نہیں پکڑے گی ــــ ے کی خواہش کس کو نہیں ہے ۔ کیا میں اس کا
رسیا نہیں ہوں؟"

خان کچھ کہے بغیر انڈا چھیلنے لگا ــــ اس نے انڈا اپنے منہ میں ڈال کر
گلاس کو مے سے بھر دیا ــــ ڈیوس نے اب کی بار پس و پیش سے کام نہیں لیا ۔ لیکن
دونوں خاموش رہے ــــ کسی نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی ــــ جب ڈیوس پی چکا تو
انڈا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے خان نے کہا ــــ

"تم مجھے عزیز رکھتے ہو؟"

ڈیوس نے کہا ــــ "ہاں میں تمہیں بے حد عزیز رکھتا ہوں۔"

خان خاموش ہو گیا ــــ اس نے گلاس بھر لی اور غٹاغٹ گیا ــــ انڈا چھیلتے ہوئے
اس نے پھر پوچھا ــــ

"تو تم مجھے عزیز رکھتے ہو"

ڈیوس نے بُرا مانتے ہوئے کہا ــــ

"خداوند یسوع نے جب یہ سوال تیسری بار اپنے چہیتے شاگرد شمعون سے کیا
تھا تو اس کے دل کو تکلیف ہوئی تھی ۔ تم اور میں تو اُن کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں ۔
اور میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں خان ۔ پھر بھی تم مجھ پر بھروسہ تو کر سکتے ہو اور اگر نہیں
کر سکتے تو زبان کیوں کھولتے ہو ــ مجھے آزمائش میں مبتلا کیوں کرتے
ہو؟ ــــ"

"اسی لئے کہیں تم پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

"پھر بتاتے کیوں نہیں؟"

"مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آ گئے" خان نے ڈیوس سے پوچھا۔
جب تم اتنے دنوں سے نہیں ملے تو میں تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہاری بیوی
مجھ پر بھروسہ کیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم باہر گئے ہو — اور اسی طرح گئے ہو جس
تم روز ہی گھر سے نکلتے تھے۔

خان کا چہرہ چمک اٹھا —" اس نے اچھا کیا — وہ کہنے لگا —"
گویا میری مدد کو بھیجے گئے ہو"

اب بتاؤ کہ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں"

"لو یہ بچی کچی پی لیں" — کچھ دیر توقف کر کے خان پھر کہنے لگا —
رنجیت سنگھ کو میں نے زبان دی تھی — اس وقت تک یہ نیا قانون نافذ نہیں
تھا — اس کے آبائی قریہ میں اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ اس کو نئے قانون
نفاذ کی اطلاع بھی نہیں ہے۔
کیونکہ
وہ دور دراز گاؤں میں رہتا ہے — مال اس تک نہیں پہنچے گا تو اس کی بڑی سبکی ہو
— میرا آدمی تمہارے ساتھ رہے گا۔ جیب میں تمہیں شراب کے بیرل اسے پہنچانا
— اسے ساری باتیں بتلا دینا کہ صبح ہونے تک اگر شراب ختم نہ ہو تو وہ ضائع کر دے
— میں سرِ عام پکڑا جاؤں گا تاکہ پکڑا جاؤں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ پولیس کو پتا چل
گیا ہے — وہ مجھے گرفتار کرے گی تو پھر مطمئن ہو جائے گی اور رنجیت سنگھ تک
پہنچنے کی کوئی زحمت نہیں کرے گا۔

"تم خود کو گرفتاری سے نہیں بچا سکتے؟"

بالکل نہیں — اور اگر بچا لوں تو رنجیت سنگھ کے رنگ میں بھنگ

پڑ جائے گا جو مجھے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں ہے۔

تو پھر اٹھو ــــــ "خداوند یسوع ہماری مدد کرے گا" ــــــ ڈیوس خان سے پہلے کھڑا ہو گیا۔

بچی کچی انھوں نے بوتلوں ہی سے پی ــــــ

خالی بوتلیں مٹی بھر کر انھوں نے ندی کے پانی میں پھینک دیں جو فوراً ڈوب گئیں۔

پل پار کر کے جب وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئے تو گھنے درختوں کے سایوں میں پہنچنے سے پہلے ڈیوس نے کہا۔

"تم مانتے ہو کہ یہ چاندنی سچی ہے جو تمہارے اور میرے اطراف پھیلی ہوئی ہے اور جو ہمارے دلوں کا راز جانتی ہے کہ ہم کیوں اس کا ساتھ چھوڑ کر گھنے جنگل کی بھیانک تاریکی میں خود کو چھپا رہے ہیں"۔

"ہاں ــــــ خان نے سینہ تان کر کہا کہ میں مانتا ہوں"

"تو پھر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اس زمین کو نہیں چھوڑو گے جس پر ہم نے جنم لیا ہے ــــــ"

"مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ چاندنی ہم پر حرام ہو گی اگر وہ کسی اور خطۂ زمین پر ہمیں ملے"۔

خان نے ڈیوس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لئے اور اتنی زور سے دبایا کہ ڈیوس مسکرا کر بھی تڑپ اٹھا۔ اس نے اپنے ہاتھ خان کی گرفت سے کھینچ کر اس وقت تک جدا نہیں کئے جب تک کہ خان کی گرفت خود ڈھیلی

نہ بدلی گئی ۔

اور پھر دونوں روانہ ہو گئے ۔

دمکتے ہوئے چاند نے اور اس کی چٹکی ہوئی چاندنی نے انھیں تاریکیوں کو سونپ دیا ۔ اور پھر صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈیوس اپنے گھر لوٹ چکا تھا ۔

اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ خان گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ ان بتلانے والوں میں سب سے اونچی آواز میں جو بول رہا تھا وہ گیتار بجانے والا جانڈس تھا جس کا اصلی نام جان ڈیوس تھا لیکن لوگ اس کو جانڈس ہی پکارتے تھے ۔

اس نے مقدس انجیل سے ماخوذ قانائی گلیل میں شادی کا قصہ سنایا تو سب کے سب اسی کا منہ تک رہے تھے ـــ میں سمجھ رہا تھا کہ ڈیوس کسی نئی بات کا انکشاف کرے گا ـــ لیکن اس نے ٹھنڈی سانس لی جو زیادہ لمبی نہ تھی اور کہنے لگا ۔

یوحنا رسول کی معرفت لکھی انجیل مقدس کی قسم خداوند یسوع خان کی مدد کرے گا کیونکہ

"صبح سویرے جب خداوند یسوع ہیکل میں آیا اور سب لوگ اس کے پاس آئے اور وہ بیٹھ کر انھیں تعلیم دینے لگا اور فقیہہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا ۔
اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے توریت میں موسٰی نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں ۔ پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے ...

یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔ جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے تو اس نے سیدھے ہو کر اُن سے کہا کہ جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس پر پتھر مارے۔ اور پھر جھک کر زمین پر انگلی سے لکھنے لگا ـــــ وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے سب نکل گئے اور یسوع اکیلا رہ گیا اور وہ عورت وہیں بیچ میں رہ گئی ـــــ یسوع نے سیدھے ہو کر اس سے کہا کہ اے عورت! یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا تجھ پر کسی نے حکم نہیں لگایا؟ اس نے کہا اے خداوند کسی نے نہیں۔ یسوع نے کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا ـــ جا ـــ پھر گناہ نہ کرنا"

یہ کہہ کر ڈیوس خاموش ہو گیا۔

سب کے سب اب بھی اس کا منہ تک رہے تھے۔

مجھے اب یہ سوچنے کی گنجائش نہیں تھی کہ ڈیوس نے کسی نئی بات کا انکشاف نہیں کیا۔

# ایک طوفان

# دو بُوندیں

میں کامنور کے ناظر کی کہانی آپ کو سنانا چاہوں تو مجھے یاد دوں کے
فینے کرید کرید کر اپنا بچپن ڈھونڈلانا پڑے گا تاکہ اس کو جھاڑ جھٹک کر
پ کے آگے پیش کرنے کے قابل بناؤں۔

کامنور کا ناظر اور میرا بچپن قریب قریب ساتھ ساتھ مر گئے ہیں اور اس
کے بعد تجربات کی بھٹی میں تپ تپ کر میرا وجود ایک سرخ لوہے کی مانند ہو گیا
ہے کہ ہر کومل سی نرم و نازک سی شئے اس سے مس ہو کر جل اٹھتی ہے۔ تب ہی تو
میرے لئے مصیبت یہ آپڑی ہے کہ میں اپنے بچپن کو جھاڑ جھٹک کر نکھاروں سنواروں
بھی اور اپنے وجود کے شعلوں سے اسے جھلسنے بھی نہ دوں۔

آیئے میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ میرے بچپن پر میری اس جوانی کا
کوئی سایہ نہ پڑے۔

ناظر جسے سب ناظر صاحب پکارتے تھے ہمارا اطالیق تھا اور ابا کا مصاحب۔ عجیب میاں قسم کا مرنجان مرنج آدمی تھا۔ دوہری ہڈی کا بھاری بھرکم انسان، خوش مذاق، خوش مزاج، خوش خوراک، ہماری دیکھ بھال اور ابا کی خوشنودی اس کا فرض اولین تھا۔ ہم نے فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم اسی سے حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ابتدائی تعلیم انتہا کو آج تک نہ پہنچ سکی۔ لیکن کا منور کے ناظر کا ہماری اس نیم حکیمی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس نے جو کچھ علم اپنے پاس تھا ہمیں چھٹپن ہی میں گھول کر پلا دینا چاہا اور بقول کسے بنیاد مضبوط ہونی چاہیئے، عمارت کا کیا ہے، اور اسی مضبوط بنیاد پر ہم آج تک ایک پاؤں پر کھڑے اینٹھتے رہتے ہیں۔ عمارت کی ہمیں خبر نہیں۔

ناظر صاحب جہاں ہم بچوں میں بہت مقبول تھے ابا بھی انہیں اتنا ہی پسند کرتے تھے۔ ناظر صاحب کا شام کا وقت جب ہم کھلے میدان میں یا چمن میں کھیل رہے ہوتے ابا کے ساتھ گذرتا تھا۔ ہم لوگ قریب ہی کہیں ہوتے تو اس تھوڑے سے وقت میں جو ناظر صاحب ابا کے ساتھ گذار رہے ہوتے ہم ان کے فلک شگاف قہقہے سنکر چمن کے اسی درمیانی حصے کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے جہاں ابا اور ان کے دوست احباب بیٹھے رہتے۔ ہمارے لئے دلچسپی کا باعث صرف ناظر صاحب کا یہ فلک شگاف قہقہہ ہوتا تھا جو ہمیں کھیل کود کے دوران بھی چونکا دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ ہم جان جاتے کہ ناظر صاحب سے ابا نے کوئی دلچسپ مذاق کیا ہے اور یہ قہقہہ اسی خوشگوار حادثے کا اعلان ہے۔

ہوتا یوں تھا کہ جب ابا کے احباب جمع ہوتے اور ان کی چائے یا ٹھنڈائی سے تواضع کی جاتی تو کبھی کبھی ابا بطور خاص امی کو ہدایت کر دیتے کہ

اوکالیاں برس رہی تھیں اور اب کے برس ان کا انداز بڑا طوفانی سا تھا۔
اوکالی تو اس طرح برستی ہے جیسے کوئی لیٹرا کسی خوشی کی تقریب کے موقع پر یکایک نازل
ہو کر دھائیں دھائیں بندوقیں داغ دیتا ہے اور ساری محفل بکھر کر رہ جاتی ہے۔
اور وہ مال و متاع لیکر فرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اب کے برس اوکالیاں جیسے ہمارے
ضلع کو تاراج کرنے پر تلی ہوئی تھیں، ایک دن نہیں گزرتا کہ وہ پھر حملہ آور ہوتیں۔ ان
بجلیاں، اتنے کڑاکے ان کے ساتھ ہوتے کہ ضلع بھر کے گھر کانپ کانپ جاتے
اور ساری بستی جیسے پانی کی چادر اوڑھ لیتی۔

ایسے میں کامنور کا ناظر ہم بچوں کو لئے ایک کمرے میں ہماری دلچسپی کا
سامان بنا رہتا۔ ہم گھبرا رہے ہوں تو ہمیں لطیفے سنا کر ہنساتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے
جب میں کوئی بارہ برس کا تھا۔ لیکن اس رات قرآن کی ایک آیت ہم بچوں کے
ورد زبان ہو کر رہ گئی تھی جو بجلیوں کے کڑاکے کے وقت خاص طور پر پڑھی جاتی تھی
اور کامنور کا ناظر بھی منہ ہی منہ میں یہی گنگناتا جھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی آنکھیں
بھی بند کر لیتا لیکن شاید ہمارے خیال سے پھر اس کی آنکھیں بغیر آواز کئے پٹ
سے کھل جاتیں کہ ہم بچے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ذہنی طور پر ہم سے جدا ہو گیا ہے۔
اس کے اس طرح تیزی سے آنکھیں بند کر لینے اور جھٹ کر یکایک کھول دینے میں اس
کی اضطراری کیفیت کا پتہ چلتا تھا۔ ورنہ آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح نہ کھلتی ہیں
نہ بند ہوتی ہیں — وہ تو دریچوں کی طرح وا ہوتی ہیں اور کواڑوں کی طرح بند
ہوتی ہیں۔

ابا ضلع کے حاکم اعلیٰ تھے اور وہ ان دنوں دورے پر تھے۔ کامنور کا

ناظر صاحب کے لئے خصوصی تیاریاں کی جائیں اور تقسیم کے وقت نہایت احتیاط برتی جائے تاکہ ان کا پیالہ یا گلاس کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب امی کیری کے افشردہ میں باریک پسی ہوئی ہری مرچ ملا دیتیں۔ یا چائے میں پسی ہوئی سرخ مرچ۔ پیشی کا ملازم بندو خاں اس راز سے واقف ہوتا اور اسی کے ذمے تقسیم کا فرض ہوتا جو ہونا چاہیے تھا پہلے تو ایسا ہوا کہ ناظر صاحب نے آدھی چائے پی لی۔ اپنے چہرے سے ناگواری کا احساس نہ ہونے دیا۔ ابا کے دوست احباب انھیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہوتے رہے۔ لوگوں نے چائے کی تعریف کی تو ناظر صاحب نے بھی کی۔ اس بار ابا نے اصرار کیا کہ اور پیجیئے ــــ ناظر صاحب نے وہی پیالی کہاں پی تھی۔ بدقت تمام چار چھ گھونٹ لیکر دکھاوے کے لئے چسکیاں لے رہے تھے۔ جب ملازم نے خالی پیالیاں سمیٹ لیں۔ تو ابا اور ان کے دوست نے ناظر صاحب کی پیالی کو دیکھا جو آدھی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ابا نے اصرار کیا کہ پسند نہیں آئی ہو تو کہہ دیجئے میں دوسری منگوا دوں ــــ ناظر صاحب جز بز ہوتے رہے۔ کہنے لگے ــــ جی ــــ جی بہت اچھی ہے ــــ لیکن ــــ لیکن ویکن کچھ نہیں، پسند ہے تو پھر پینی پڑیگی ــــ سبھوں نے اصرار کیا ــــ اور ناظر کا منوری نے ایک دو گھونٹ حلق سے جلدی سے اتارنے کی کوشش میں منہ بنایا لیکن نگل نہ سکے تو سبھوں کی ہنسی نکل گئی۔ جب اصلی بات ناظر صاحب کی سمجھ میں آئی تو ان کا قہقہہ ساری فضا میں پھیل گیا۔ چھت سے لگی امی بھی گھڑی تھیں سو ہنس پڑیں۔ اس کے بعد ناظر صاحب نے ایک نہیں دو پیالیاں منگوائیں جن میں لبالب ملائی بھری ہوئی تھی۔

ایک دن تو کامنوری کے اس ناظر نے کمال ہی کر دیا - کیری کا افشردہ جس میں ہری مرچ باریک پیس کر ملائی گئی تھی اسس قدر اطمینان سے پی گئے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے - سبھوں نے یہ سمجھا کہ آج ناظر صاحب کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا جا سکا ہے جس کا تذکرہ ابا نے پہلے ہی احباب سے کر رکھا تھا - بندو خان جس گلاس کی طرف اشارہ کر دے اسے کوئی چھوئے ہی نہیں - سبھوں نے احتیاط برتی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور ناظر صاحب اطمینان سے ہونٹ چاٹتے بیٹھے رہے - خالی گلاس لے جانے کے لئے جب ملازم آیا تو ناظر صاحب نے کہا کہ میاں اب اصلی شربت کے دو گلاس لا دینا - سبھوں نے پوچھا تو کیا وہ اصلی شربت نہ تھا - جو آپ نے ابھی ابھی پیا ہے تو ناظر صاحب نے اپنا فرمائشی قہقہہ فضا میں بکھیر دیا - کہنے لگے وہ تو کیری کی سیال چٹنی تھی - جو میں نے اس تحمل سے اسس لئے پی لی کہ آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ہی نہ دوں - سبھوں نے ان کی اس زندہ دلی کی داد دی اور ابا نے ہار مان لی کہ کبھی آج تم جیتے اور میں ہارا -

ناظر صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے - ابا کی ان سے اس قدر بے تکلفی کے باوجود کبھی ہم بچوں کی جرات نہ ہوتی جو ان سے ایسا کوئی ناشائستہ مذاق کرتے جو آداب اور تمیز کے مغائر ہوتا - وہ ہم سب سے بڑی شفقت اور پیار سے پیش آتے - بڑی دل دہی سے ہمیں پڑھاتے اور یہ ساری پڑھائی لکھائی بڑی دوستانہ فضا میں اسطرح ہوتی کہ ہمیں بوریت کا کبھی بھی احساس نہ ہوتا - بیٹھی کے بندو خان اور ناظر صاحب میں بڑی گھلتی تھی - اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بندو خاں اندرون خانہ سارے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے

ناظر صاحب بھی بحیثیت اطالیق چونکہ گھر ہی کے ایک فرد ہو گئے تھے اس لئے انھیں بندو خاں کی اہمیت کا اندازہ تھا۔

ادھر بندو خاں کا یہ حال تھا کہ وہ ناظر صاحب کی قابلیت اور علمیت کے بڑے معترف تھے۔ گٹھیلے بدن کے یہ بندو خاں جب ہمارے گھر میں پہلے پہل ملازم ہوئے تھے تو بڑے گاؤدی قسم کے پھکڑ آدمی تھے۔ ان کے اوصاف نے ابا اور امی کے دلوں پر جو نقوش ثبت کئے تھے وہ زیادہ تر ان کی مثالی دیانتداری کا سبب تھے۔ بڑے سے گھیر دار شملے، سفید کرتے اور سفید دھوتی میں ملبوس بندو خاں کو رہن سہن کے آداب اور بات چیت کی تمیز تو خیر آتے آتے آئی لیکن کچھ ہی دلوں میں انہوں نے اپنی ایمانداری کے بوتے پر گھر کی ساری چابیوں پر قبضہ کر لیا۔ باورچی کو غلہ بندو خاں ہی دیتے۔ چپراسیوں سے سودا سلف بندو خاں ہی منگواتے، دھوبن کو کپڑے لتے کا حساب بندو خاں ہی کو بتلانا ہوتا۔ گوالا بھینس لے کر صبح و شام دروازے پر آتا تو دودھ دھونے کے لئے بندو خاں ہی کا منتظر رہتا اور بندو خاں ملیے سے رجسٹر میں ہر شئے کا حساب کتاب اس قدر نفاست سے لکھ رکھتے جیسے ابا یا امی اس کی آڈٹ کرنے والے ہوں۔ ویسے بندو خاں کو اس بات کا علم تھا کہ ان پر اس حد تک ان کے مالکوں کو بھروسہ ہے کہ حساب کتاب بتلانے کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن ان کی اپنی دل کی دنیا ان کے اپنے ایمان کی روشنی سے جو منوّر ہو جاتی۔ اور یہی نُور تو بندو خاں کی زندگی کا نور تھا۔

بندو خاں کا خط بڑا پختہ اور بہت ہی خوبصورت تھا۔ ابا نے جب پہلی بار ان کی تحریر دیکھی تو بڑے متعجب ہوئے۔ سامنے لکھوا کر یقین کیا تو ہر

قریبی دوست کے آگے ذکر کیا۔ ابا کی زبانی اپنی تعریف اور توصیف سنکر بندو خاں پھولے نہ سماتے۔ اپنے خط پر ان کو بھی بڑا ناز تھا۔ لیکن اب تو ان میں ایک ایسی خود اعتمادی پیدا ہوگئی تھی جو اتنے بڑے گھر کا نظم و نسق چلانے کے لئے شاید ضروری تھی۔

ناظر صاحب سے بندو خاں کی یگانگت کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ بندو خاں ان کی علمیت کے معترف تھے تو وہ بندو خاں کی خوش نویسی کے مداح۔ فارسی اور اردو شاعروں کے بے شمار پسندیدہ اشعار جو ناظر صاحب کی بوسیدہ بیاض میں محفوظ تھے وہ انھیں ایک نئی بیاض میں بندو خاں سے نقل کروا رہے تھے گھر کے کام کاج سے فراغت پاکر راتوں کو بندو خاں بڑے انہماک سے یہ کام کرتے رہتے اور اسی کام کے دوران وہ آہستہ آہستہ ناظر صاحب کی قابلیت کے دل ہی دل میں معترف ہوتے گئے کیونکہ بیاض میں لکھے اکثر شعر ان کی سمجھ میں نہ آتے جنھیں وہ من و عن نقل کرتے۔

ناظر صاحب ناشتے سے فراغت پاکر ہمارے گھر چلے آتے، پھر اپنے گھر لوٹتے لوٹتے انھیں رات کے دس بھی بج جاتے گیارہ بھی، ہم ان دنوں اسکول نہیں جاتے تھے۔

ناظر صاحب ہی ان دنوں ہماری دیکھ بھال کرتے اور تعلیم و تربیت کا فرض پورا کرتے۔ ایک بڑے سے کمرے کے نصف حصے میں ہم بچوں کی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور دوسرے نصف حصے میں قطار سے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ شام کے پانچ بجے تک ہمیں اپنی اسی دنیا میں سانس لینا ہوتا۔ پانچ بجے

ہمیں باہر نکلنے کی اجازت تھی جس کے ہم دن کے تین بجے ہی سے بے چینی سے منتظر رہتے ۔ قریب قریب سارا دن کا منور کسے یہ ناظر صاحب ہمارے دل دماغ پر سوار رہتے ۔ ان کے پڑھانے کا سلسلہ تین تین گھنٹے تک چلتا یہ تین گھنٹے ہمارے لئے دو بھر نہ ہوتے ۔ فارسی اور اردو پر ناظر صاحب بہت توجہ دیتے ۔ سبق آموز اور نصیحت آمیز کہانیاں بڑے مزے لے لیکر اس طرح سناتے جیسے وہ خود اس کے ہیرو ہوں ۔ پھر یہی کہانیاں ہمیں دہرانی پڑتیں اور نصیحت کا جو پہلو ان میں پوشیدہ ہوتا وہ ناظر صاحب کو بتلانا پڑتا ۔ اور یہ اہم بات ہم سب چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر لکھ کر ناظر صاحب کے آگے پیش کر دیتے ۔ ناظر صاحب ان پرچیوں کو دیکھ کر نمبر دے دیتے اور نمبروں کے اعلان کے بعد اس دن کی حکومت زیادہ نمبر حاصل کرنے والے بچے کو سونپ دی جاتی ۔ ناظر صاحب پرچیوں کی جانچ کرتے وقت بچے کی عمر اور اس کی علمیت کے پیش نظر بڑے فراغ دل ہو جاتے ۔

اردو فارسی کے سلیس اشعار وہ ہمیں یاد کراتے ۔ پھر بیت بازی کے مقابلے ہوتے ۔ جو ٹیم جیتی ہوئی ہوتی اس میں بھی جس نے سب سے زیادہ شعر سنائے وہی اس دن کا صدر چنا جاتا جس کو شاہ امروز کا نام دیا جاتا ۔ جیتنے والی لڑکی ہوتی تو وہ ملکۂ امروز بنتی ۔ اور اس کا اعزاز یہ ہوتا کہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں سات چاکلیٹ اس کو زیادہ دیئے جاتے ۔

ناظر صاحب ہمیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مجبوراً وہ اس زبان سے نباہ کر رہے ہوں ۔ شاہ امروز کو ابا (King of the day) پکارتے اور ملکہ کو (Queen of the day)

شام کو جب ہم بن سنور کر تفریح کے لئے نکل رہے ہوتے تو شاہ امروز اور ملکہ امروز کا ابا اور امی سے تعارف کرایا جاتا۔ لیکن ابا نہ کبھی شاہ کو شاہ کہتے نہ ملکہ کو ملکہ وہ ہمیشہ (King اور Queen) ہی کے القاب استعمال کرتے۔

ابّا انگریزی زبان کے بڑے رسیا تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بچے گٹ پٹ کریں۔ وہ ناظر صاحب کو تاکید کرتے کہ وہ زیادہ تر ہم بچوں سے انگریزی ہی میں بات چیت کریں۔ ناظر صاحب انگریزی میں بات کرتے تو ایسی بوجھل سی اکتا دینے والی فضا بن جاتی کہ ہم لوگ اس پابندی کے خلاف احتجاجاً بات ہی نہ کرتے۔ سچ پوچھئے تو بات کرنا بس میں نہ ہوتا لہذا کچھ دیر تک خاموشی کا راج رہتا جس کو توڑنے کے لئے ناظر صاحب انگریزی میں ہر ایک کو مخاطب کرتے اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہی زبان ہماری محبتوں کا وسیلہ بن جاتی جس میں ہم نے تتلانا سیکھا تھا۔

اسکول بھجوانے سے ابّا اس لئے اجتناب کرتے کہ ہمارا عام لڑکوں سے ملنا جلنا انہیں گوارا نہ ہوتا۔ ابّا نہ صرف ضلع کے حاکم اعلیٰ تھے بلکہ حکومت کے سربرآوردہ امرا کے خاندان سے تھے۔ زندگی کو انہوں نے ہمیشہ بلندی سے دیکھا تھا۔ اتنی بلندی سے کہ زمین کے پہاڑ بھی انھیں چھوٹے چھوٹے نظر آتے تھے۔ یہ انداز نظر انھیں ورثے میں ملا تھا۔ بھلا ایسے میں ہمارا عام بچوں سے ملنے جلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسی لئے اسکول کا سارا نصاب ہمیں گھر ہی پر پڑھایا جاتا۔

ایک دن تعلیمی ٹاش میں زیادہ نمبر حاصل کر کے حسنہ ملکۂ امروز

بن گئی۔ اس دن مروجہ اصولوں اور قاعدہ کے مطابق منٹ بھر کے لئے اپنے کمرے سے باہر نکلنے کو بھی ہمیں حسنہ کی اجازت لینی پڑتی۔ سارے بچوں پر غنودگی طاری تھی۔ حسنہ جو میری بنت عم ہے اور ملکہ امروز تھی وہ جاگ رہی تھی دوسرے بستروں پر ۔ ۔ ۔ ۔ چھوٹا تو واقعی سو گیا تھا۔ بڑا یہ باور کرانے کی سعی کر رہا تھا کہ وہ سو گیا ہے۔ ناظر صاحب آرام کرسی پر دراز اونگھ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے سُن رکھا تھا کہ جب لوگ سو جاتے ہیں تو اکثر و بیشتر ناظر صاحب جھپٹ کر قریبی کسی مکان میں ہو آتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ ایسے میں بندو خاں باہر کے احاطے میں مشرقی گیٹ کے قریب ہری ہری باڑھ کے پہلو میں چھپے ناظر صاحب کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اور جب ان کے برابر پہنچ جاتے ہیں تو وہ چھپاک سے کوئی شئے ان کو دے دیتے ہیں جسے چھپا کر ناظر صاحب روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات مومن بی نے بتلائی تھی اور نبی چپراسی نے اس کی تائید کی تھی۔

نبی چپراسی اور مومن بی کی ایک علحدہ تاریخ ہے۔ بلکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صرف مومن بی کی ایک علحدہ تاریخ ہے اور نبی صاحب تو صرف تاریخ کا ایک باب ہیں۔ مومن بی بالکل سیاہ رنگ کا ایک ایسا چمکدار کوئلا تھیں کہ دھوپ کی کرن پڑنے سے اس کوئلے میں رنگ روپ کی جو دنیا چھپی رہتی ہے وہ سطح پر ابھر آتی ہے۔ دھوپ کی اسی کرن کی طرح ہر نوجوان چپراسی، پہرہ دار اردلی اور گنٹر سوار نے پہلی نظر پھینک کر ہی روپ کی وہ چھایا مومن بی کے انگ انگ پر دیکھی کہ سارے ضلع میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ مومن بی کا طوفانی شباب تھا تو انھوں نے بڑھ کر نبی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بس اس وقت سے

بی صاحب مرتے دم تک خاموشی سے خدمت انجام دیتے رہے تھے۔

مومن بی چچی اماں کی باندی تھیں۔ بندو خاں کو رجھانے کی ساری عشوہ طرازیاں بے کار ثابت ہوئیں تو وہ ان کی مخالف ہو بیٹھیں۔ بندو خاں کو دھکا پہنچانا بے چاری مومن بی کی بے بضاعتی کے بس میں تو تھا نہیں بس جو کچھ تھا سو ان کے ناز نخروں کے بس میں تھا۔ جب وہ انھیں اس جادو سے بھی رام نہ کر سکیں تو انتقامی جذبے کے تحت اندر اندر سلگتی رہیں۔ لیکن بندو خاں کے خلاف کھلے بندوں آواز اٹھانے کی ان میں ہمت نہ تھی انھوں نے چھوٹے چھوٹے پیمانے پر ہم بچوں کے کان بھرنے شروع کیے۔ پہلی بات جو بندو خاں کے بارے میں ہمیں بتائی گئی تھی۔ وہ یہی تھی کہ بندو خاں اور ناظر صاحب آپس میں مل جل کر آہستہ آہستہ گھر کا سامان پار کر رہے ہیں اور اس طرح ہمارا گھر اجاڑ کر وہ اپنا اپنا گھر بسانے کی فکر میں ہیں۔

ناظر صاحب کے مزاج کا ایک پہلو ایسا بھی تھا جو غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہ آتا۔ اچھی اچھی باتیں کرتے کرتے لطائف اور چٹکلے بیان کرتے کرتے کبھی کبھی وہ یک لخت مٹی کے پتلے کی طرح خاموش ہو جاتے۔ ہماری محفل میں رہ کر بھی دیا ہماری محفل میں نہ ہوتے۔ یوں لگتا جیسے کسی یاد آنے والے کو بھلا رہے ہوں۔

آج حسنہ ملکہ امروز تھی تو اس نے پہلے تو مٹ مٹ ناظر صاحب کی طرف شریر نظروں سے دیکھا جو غنودگی کے عالم میں آرام کرسی پر دراز تھے پھر اس نے نظروں ہی نظروں میں مجھے اپنے قریب بلایا۔

بھیا ۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ آج دیکھتے ہیں کہ ناظر صاحب کہاں جاتے ہیں۔ میں نے بھی دلچسپی لی ۔۔۔ واقعی آج یہی مہم سر کر لیں کیونکہ ملکہ امروز جو ٹھہری اپنے مقصد میں میں نے سوچا۔

لیکن ناظر صاحب اپنی کرسی پر سے جیسے اچھل پڑے۔ کسی نے برف کا ٹھنڈا پانی جیسے چھپاک سے ان کے منہ پر دے مارا ہو۔ انہوں نے سامنے لگی گھڑی پر اس طرح نظر ڈالی جیسے ٹرین چھوٹی جا رہی ہو ــــــ اور ہم سے کہنے لگے ہم فوراً سو جائیں۔ حسنہ کی تنبیہ بھی انہوں نے کی۔ کہا کہ آج ملکہ ہو کر تم نے نہ انہیں وقت پر سو جانے کا حکم دیا نہ خود بستر پر گئیں۔

حسنہ اور میں اپنے اپنے بستروں پر بھاگے اور دھڑام سے گر کر بس منٹ بھر میں یوں بے سدھ ہو گئے جیسے آنکھ لگے دیر ہوئی ہو۔

ہم نے دیکھا ناظر صاحب چوروں کی طرح ہال میں ٹہلتے رہے دو منٹ میں تین بار انہوں نے گھڑی دیکھی۔ پھر ہم لوگوں کی طرف اس طرح دیکھا جیسے سوئے ہوؤں پر چادر اڑھا رہے ہوں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم لوگ سوئے نہیں ہیں دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گئے اور احتیاط سے پردہ برابر کر دیا۔

حسنہ بجلی کی سرعت سے اٹھ بیٹھی۔

میں نے کہا پگلی "لیٹ جا" ــــــ ہو سکتا ہے وہ پردے کی اوٹ سے ہمیں دیکھیں۔ دیکھا جائے گا۔ حسنہ نے تن کر کہا ــــــ مگر بھیا ذرا تمیز سے بات کرو نا۔ تم ملکہ سے بات کر رہے ہو۔

میں نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ آج اس سے ملکہ رہنے ہی میں عافیت تھی ــــــ "معاف کر دو ملکہ" ــــــ میں نے کہا۔

"کرتے ہیں" ــــــ اس نے اختصار سے کام لیا۔ بالکل شہزادیوں کا سا انداز تھا اس کا۔

کیا یاد کرے گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ سہہ لیں گے اس کی اکڑ فوں آج۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ ناظر صاحب جاچکے ہیں تو میں نے حسنہ سے پوچھا: کیا حکم ہے ملکہ امروز۔

پلنگ سے اترتے ہوئے اس نے کہا۔ چلتے ہیں۔ اور بڑی تمکنت سے پردے تک آکر رک گئی۔ پھر ٹھٹک کر مجھے بلایا۔

"بھیا مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، پہلے تم جاکر ذرا دیکھ آؤ ناکہ سب بڑے لوگ کہاں ہیں۔ سونے کے وقت گھومتے ہوئے پکڑ لئے گئے تو پٹائی ہوگی"

"اور اگر میں پکڑا گیا تو؟"

"تمہارا کیا ہے۔ تم عام آدمی ہو۔ میں تو ملکہ ہوں نا"

"باپ رے۔ یہ بات ہے" میری زبان سے نکلا۔

"ہاں ہاں بالکل یہی بات ہے" وہ تنک کر بولی" وقت پڑے تو تمہیں بڑا بھی سکتی ہوں کہ میں نے کام سے بھیجا تھا"

میں نے اس کی بات کی اہمیت کو محسوس کیا۔ واقعی آج وہ یہ سب کر سکتی تھی۔ آج وہ ایک صاحب اقتدار ہستی تھی۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور پردہ ہٹا کر دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

صحن میں پہنچ کر باہر کے احاطہ میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہا ہوں کہ کسی نے کھکارا۔ آواز میں نے پہچان لی۔ امی ہی تھیں۔ حواس ٹھکانے ہوئے تو میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ چچی امی، چچا ابا کی اچکنیں تہہ کرنے میں محو تھیں۔ ان کے کھکارنے کا تعلق قطعی مجھ سے نہیں تھا۔ بس وہ اپنے کام میں مصروف

تھیں اور اپنی آواز کی نزاکتوں میں گم، کچھ گنگنا رہی تھیں کہ شاید حلق میں پتی آ گئی۔ بچی امی کی آواز بڑی سُریلی تھی وہ اکثر گنگناتی رہتیں۔

میں نے جی ہی جی میں سوچا۔ انھیں کی دختر نیک اختر کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں۔ وہ کچھ کہیں گی تو انھیں بتلا کر خوش کر دوں گا کہ آج حسنہ ملکہ امروز ہے اور میرے لئے اس کی ہر بات مان لینا ضروری ہے۔ لیکن چچی نے جب ادھر کوئی توجہ ہی نہ کی تو میرا جی چاہنے لگا کہ وہ ادھر توجہ کریں۔

ویسے حسنہ ملکہ ہونے کے باوجود بھی اپنے دائرہ اقتدار و اختیار سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ مثلاً وہ اس کی مجاز نہ تھی کہ کڑی دوپہر میں جبکہ چلچلاتی دھوپ سے ہر ذی نفس پناہ مانگ رہا ہو کسی بھائی یا بہن کو چپراسیوں کے کمرے تک بھی یہ کہہ کر بھجوائے کہ ریوڑیاں منگوا دو یا لال لال ٹیڑھی ٹیڑھی، میٹھی گولیاں۔ یا بوڑھی کے بال یا تل کے لڈو لیکن یہ بات طے تھی کہ جانے والا پکڑا جائے اور اس بات کا انکشاف کر دے کہ وہ آج کی ملکہ یا آج کے شاہ کے کام پر جا رہا ہے تو اس سے کچھ پوچھ تاچھ نہ ہوتی۔ شام کو جب ملکہ یا شاہ کا بزرگوں سے تعارف کرایا جاتا تو اس کے دور حکومت میں جس بے راہ روی کو اس نے روا رکھا تھا۔ اس کی نسبت استفسار کیا جاتا۔ تنبیہ کی جاتی تھی اور اگر جرم سنگین ہوتا تو ایک ہفتہ تک ملکہ یا شاہ کو معزول کر دیا جاتا وہ اسطرح کہ اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت وہ دو ایک ہفتے کے اندر ملکہ امروز یا شاہ امروز بن سکتا تو بھی نہ بنایا جاتا۔

بہرحال یہ کہ میدان صاف تھا۔ اور ملکہ حسنہ بغیر کسی پابندی کے باہر نکل سکتی تھی سو میں نے لیک کر اس کو اطلاع دی لیکن وہ مانی نہیں۔ بچی امی سے وہ

ڈر رہی تھی۔ طے ہوا کہ میں اسے اپنی آڑمیں اوٹ کی طرح چھپالونگا ـــ لہذا
ہم پیر دبا کر پنجوں پر چلتے ہوئے اس طرح باہر کے احاطے تک آپہنچے جیسے
ساری دنیا اپنا سب کچھ تیاگ کر بس ہماری ٹوہ میں لگی بیٹھی تھی۔ ـــ باہر کی کھلی فضا
میں سانس لیکر ہمیں چلچلاتی دھوپ کا احساس ہوا نہ تپتی ہوئی زمین کا۔ ننگے سر
ننگے سر ننگے پاؤں ہم تو ہم پر چل پڑے تھے۔ احاطے کے بغیچے کی پچھلی گیٹ تک
پہنچنے کے لئے بیرہ بیٹھک سے ہوکر گذرنا تھا۔ بیٹھک میں بنی صاحب ہوئے تو کوئی
بات نہیں مومن بی کے نام کی دہائی ان کے لئے کافی تھی۔ لیکن کوئی دوسرا
ہوا جیسے وہ بھینڈی چاؤش جس نے ابا سے، جب وہ شروع شروع اس
ضلع پر آئے تھے تو کہا تھا کہ میں سپاہی بچہ ہوں کرسی نہیں اٹھاؤنگا ـــ
بات دراصل یوں ہوئی تھی کہ ابا نے برسراجلاس اس کو حکم دیا تھا کہ کرسی
اٹھا لاؤ۔

چھوٹتے ہی بھینڈی چاوش نے جواب دیا کہ میں سپاہی بچہ ہوں،
تلوار اور بندوق اٹھاتا ہوں کرسی نہیں اٹھاتا۔

ابا نے عدول حکمی کی پاداش میں ایک مہینہ کے لئے اسے معطل
کر دیا۔

میں پہلے آپ کو بھینڈی چاؤش کی اصطلاح اور خصوصیات سمجھاتا
چلوں۔ حیدرآباد کی نظام حکومت میں اکثر دبیشتر خزانے کے پہروں پر دربار وں
کے پہروں پر ایسے عرب متعین تھے جو عربستان سے آکر یہاں رہ بس گئے
تھے۔ شملہ اور تہبند باندھتے تھے۔ خنجر تہبند میں اڑس رکھتے تھے۔ اس خنجر کے

بل بوتے پر ان کی شجاعت اور بہادری کے افسانے زبان زد خاص و عام ہوتے ان عربوں کا دیکھا دیکھی یہاں مقامی باشندوں نے بھی جو اس طرح کی ملازمت سے وابستہ تھے۔ تہبند باندھکر خنجر اڑس رکھنا اپنا شعار گردانا ـــــ وہ اردو بات عربی لہجے میں کرتے اور اس تقلید پر فخر محسوس کرتے ـــــ ان کی اس گراوٹ پر لوگوں نے انھیں "بھینڈی چاؤش" پکارنا شروع کیا۔ بھینڈی چاؤش کی نسبت میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ آپ بھی نہ جانئے۔ ہاں ایک اضافہ چاؤش کے ساتھ لچھو کا بعد میں ہوا۔ یہ لچھو پس ماندہ طبقہ کی پڑی جھڑی ایسی عورت کا سمبل ہے جو چاؤش کی داشتہ بنکر اس کے ساتھ رہنے میں اپنی توقیر سمجھتی ہے۔ پھر اس لچھو کے لئے عربوں نے ایک دوسرے کو قتل بھی کیا۔ خون خرابے بھی ہوئے۔

ہاں تو جب ابّا نے پہرے کے اس بھینڈی چاؤش کو معطل کردیا تو اس نے معذرت خواہی کی اور انہوں نے اس شرط سے معاف کر دیا کہ وہ کرسی سر پر اٹھاکر دفتر کے اطراف احاطے میں چکر لگائے۔ بھینڈی چاؤش نے تعمیل کی۔ اس کی لچھو نے خوب ہنس ہنس کر اس کو چھیڑا جب وہ کرسی سر پر اٹھائے چکر لگا رہا تھا۔ پھر سزا کی معافی کی خوشی میں دونوں نے جی بھر کر تاڑی پی۔ یہ بات بھی ہم نے سُنی۔

اب یہ بھینڈی چاؤش کچھ ایسے وفادار ہوئے کہ انہوں نے ہم بچوں کو بھی بے وقت گھر کے باہر دیکھا تو کبھی نہ بخشا۔ اور ابا سے شکایت کی۔ اللہ کی یہ کرنی ہوئی کہ اس وقت پہرے پر یہ وفا شعار نہ تھا۔

ں اور حسنہ بغیچے کی پچھلی گیٹ پر عین اُسی وقت پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
بلکہ بندو خاں واقعی کوئی شئے بستی میں چھپا کر ناظر صاحب کو دے رہے تھے اور
ناظر صاحب اسے ایکر تیزی سے روانہ ہو گئے تھے۔

حسنہ نے مجھے ٹھوکا دیا ــــ دیکھا بھیّا مومن بی سچ کہتی

ہیں نا ــ

مجھے بھی کچھ عجیب سا لگا ــ جو دکھ مجھے اس وقت ہوا تھا اس کا احساس
تک ذہن میں جیسے کہیں چھپا بیٹھا ہے اور اس کیفیت کی یاد دلاتا ہے جو
پر طاری ہو گئی تھی میرا تو اس وقت جی چاہا تھا کہ رو پڑوں۔ اس کی وجہ شاید بندو
ں کی ایمانداری کا وہ تصوّر تھا جو ابّا اور امی کے رویے سے امانتاً ہم تک
یا تھا ــ اور آج ساری بنیادیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ میں نے جھرجھری لی اور
ے ہوش میں آتے ہی حسنہ کی بانہہ میں چٹکی بھر لی۔

"کیوں نوچتے ہو بھیّا" ــ

دیکھ کیا رہی ہے ــ چل بھاگ چلیں۔ بندو خاں نے دیکھ لیا تو

تقاماً۔

لیکن اس نے میری پوری بات سُنی نہیں۔ بگڑ کر بولی۔

"بھولتے کیوں ہو کہ میں ملکہ بھی ہوں۔ صرف حسنہ نہیں ہوں"

جی چاہا گردن پکڑ کر اس کو بندو خاں کے آگے ڈھکیل دوں جو
ستہ آہستہ اب گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن مجھے اپنی بھی تو
منانی تھی۔ گھنی باڑھ کی اوٹ میں چھپے ہم بندو صاحب کو نظروں سے

اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے۔

لیکن جب جھکے جھکے دب دب کر ہم باڑھ کی اوٹ میں گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے مجھے گمان ہوا کہ بندو خاں نے ہمیں اس مقام پر دیکھ لیا ہے جہاں باڑھ کچھ سوکھ گئی تھی اور اتنی گہری نہ تھی۔ میں نے حسنہ کو ٹوکا۔

"ملکہ امروز"

"ہاں جی"

"راستہ خاص سے بھاگ چلیں" — یہ وہ راستہ تھا جہاں سے ملازمین کو آمد و رفت کی اجازت نہ تھی لیکن ہمارے کمرے میں پہنچنے کے لئے یہ قریب ترین راستہ تھا پر اتنا ہی کٹھن بھی۔ کٹھن اسلئے کہ ابا اور امی کے کمروں کے بالکل پاس سے ہو کر ہمیں گذرنا پڑتا تھا۔

ملکہ نہیں مانی۔

میں نے کہا — بندو خاں تعاقب کر رہے ہیں۔

اب اگر ہم اور آگے بڑھتے تو یہ راستہ پیچھے چھوٹ جاتا تھا۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا حسنہ (اب میں پھر بھول گیا تھا کہ وہ ملکہ بھی ہے) دیر مت کرو — اور ہم دونوں بھاگے — میں نے دیکھا ملکہ ابا کی پشت سے ٹکرا گئی ہے جو دفتر سے غالباً قبل از وقت لوٹ گئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے میں خود کو دروازے کی اوٹ میں چھپا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے حسنہ کی وہ نگاہیں بھی نہیں بھولتی ہیں جن نگاہوں سے اس نے مجھے اس وقت دیکھا تھا۔ اب جو میں بگٹٹ بھاگا تو بندو خاں کے بالکل مقابل

تھا۔لیکن اسس وقت میں ایک ایسے بڑے حادثے سے بچ کر نکل آیا تھا کہ بندو خاں اپنے تن و توش کے باوجود مجھے کچھ ٹھگنے ٹھگنے سے بونے بونے سے لگے۔ غیر شعوری طور پر میرا ذہن ان سے خوف کھانے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کے درپے تھا۔ شاید میں کچھ اسطرح سوچ رہا تھا کہ میں ریل کے انجن سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا ہوں اور کسی بچے کی ٹرائیکل سے ٹکرا گیا ہوں۔

لیکن حسنہ بیچاری ــــ بدنصیب ملک

بندو خاں نے رعب کسا ــــ میں نے دیکھ لیا ہے بابا۔

مجھ میں بھی تو کوئی باغی جاگ گیا تھا ــــ میں نے جواب دیا۔ میں نے بھی سب کچھ دیکھ لیا ہے بندو خاں۔

کیا دیکھ لیا ہے ــــ بندو خاں ذرا سا چونکے۔

"وہی کہ تم ناظر صاحب کو چھپا چھپا کر کچھ دیتے ہو۔"

"کچھ کیا دیتا ہوں ــــ کھانا دیتا ہوں ــــ سونا چاندی نہیں دیتا۔"

کھانا دیتے ہو؟ ــــ یہاں انھیں کھانے پینے کی کوئی کمی ہے! مجھے ایک اور دھچکا سا لگا ــــ بندو خاں کی بڑائی ایک سیاہ دھبہ بنکر میری نظروں میں سمٹ گئی۔ میں کچھ دیر پہلے ان کے تعلق سے مشتبہ ہو گیا تھا اب یہ بات تو اور بھی کھل کر رہ گئی کہ وہ چوری بھی کر رہے ہیں اور سینہ زوری بھی۔

لیکن بندو خاں نے بڑی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا ــــ یہ بات کسی کو بتلانا مت وہ کہنے لگے ــــ میں آپ کو سب کچھ بتلاؤنگا۔

میں اب زیادہ وضاحت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ

میرا سانس ٹھیک ہو رہا تھا اور میں نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے پھر وہی فکر دامن گیر ہوئی کہ اپنے گوشہ عافیت میں محفوظ پہنچ جاؤں سو میں مزید کچھ بندو خاں سے کہے بنا چل دیا۔

ملکہ جب کمرے میں لوٹی تو بہت سہمی ہوئی تھی اور ہانپ رہی تھی سانس ٹھیک کر کے اس نے کہا ـــ چچا ابا نے کچھ نہیں کہا ـــ صرف اس قدر پوچھا کہ آج کنگ کون ہیں۔

میں نے کہا کہ جی میں ہی کوئین ہوں۔ اس پر انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں اب تک کانپ رہی ہوں۔

شام کو ملکہ امروز حسنہ ایک ہفتے کے لئے معزول کر دی گئی۔

لیکن میرے لئے اس واقعہ سے بڑا ایک حادثہ پیش آیا ـــ میں حادثہ اس بات کو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس بات نے میرے لئے زندگی کو سمجھنے کے کچھ راستے متعین کئے۔ اور میں نے اپنی کم عمری میں سب سے زیادہ اسی بات پر سوچا اور غور کیا تھا۔

بندو خاں نے مجھے بتایا کہ ناظر صاحب کی اکلوتی بیٹی یہیں ضلع میں ان کے ساتھ رہتی ہے۔ مصلحتاً انہوں نے ابا اور امی کو یہ بتلا دیا تھا کہ بچی کو انہوں نے اپنے وطن کامنور بھجوا دیا جہاں ان کی بہن ہے۔ سچ پوچھئے تو ناظر صاحب کا سوائے اس بچی کے اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے اس جھوٹ کو گھڑنے کی ضرورت کیوں محسوس کی مجھے یاد ہے مجھے اس جھوٹ نے بے حد صدمہ پہنچایا تھا ـــ ابا پر اس بات کا انکشاف ہوتا کہ ناظر صاحب

ی کوئی لڑکی بھی ہے تو وہ ہر طرح اس کی دست گیری کرتے — چھپے چوری تین وقت کے کھانے کے لئے ناظر صاحب نے اپنی اہمیت کو اس قدر گھٹا لیا تھا جبکہ ہر چیز ان کے بس میں تھی۔ یہ بات کچھ میری سمجھ میں نہ آئی — اسی لئے میں نے بندو خاں ی سب کچھ سنکر انھیں ایسی تیکھی نظروں سے دیکھا کہ وہ جان گئے کہ میں ان کی باتوں سے طمئن نہیں ہوا ہوں۔

کچھ دیر سوچ کر بندو خاں نے مجھے قریب کر لیا۔ پھر بڑی شفقت سے ہنے لگے — بابا کمخواب میں ٹاٹ کے پیوند نہیں لگتے۔ صاحب کو معمولی گھرانوں کے وں سے آپ لوگوں کا ملنا جلنا پسند نہیں ہے۔ ناظر صاحب کی اکلوتی بیٹی انھیں بہت یاری ہے، وہ اسے یہاں لاتے ہیں تو وہ روز ہی یہاں آنے کے لئے ضد کر سکتی ہے ظر صاحب کی حاضری یہاں ہر روز ضروری ہے۔ اپنی بچی کے ساتھ آنا اگر صاحب ر معلوم ہو تو۔ اور اب یوں بھی بچی بڑی ہو رہی ہے۔ پھر بندو خاں کہنے لگے آپ کا گھر یرا گھر بھی ہے بابا' میں کوئی سونا چاندی نہیں لٹا رہا ہوں۔

بات میری سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن میں اپنے نیم پختہ شعور کے باوصف کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کیا ہم اس زمین پر نہیں رہتے۔ کیا ہم اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ زمین پر رہنے والے ہمیں چھوٹے دکھائی دیں۔

میں نے بندو خاں سے وعدہ کیا کہ یہ راز میں کسی کو نہیں بتلاؤنگا۔ اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ قصہ پارینہ ہوا۔

لیکن آج کی رات تو بھیانک حد تک تاریک تھی۔ آج کی رات تو اوکالیاں اس طرح برس رہی تھیں جیسے پھر برسنے کا نام نہ لیں گی۔ بجلیاں اسطرح

چمک رہی تھیں جیسے تاریکی کے ہر تصوّر کو نابود کر کے رکھ دینگی۔ گرج اور کڑاکے ایسے تھے کہ زمین کی بے بسی پر آسمان دھاڑیں مار کر روتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ناظر صاحب ہم بچوں کے جھرمٹ میں آنکھیں بند کئے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر سے اسطرح چونک اٹھتے تھے جیسے بجلی انھیں چھو چھو کر گذر رہی ہے۔

بچے اونگھنے لگے۔ یہاں تک کہ سب سو گئے۔

میں نے ناظر صاحب سے کہا ــ "مولوی صاحب آپ چلے جائیے۔ آپ کی بیٹی اکیلی ہو گی۔

انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے اسطرح دیکھا جیسے کوئی بچہ ماں کے بطن سے ابھی ابھی دنیا میں آیا ہو۔

میں نے پھر کہا ــ میں سب جانتا ہوں مولوی صاحب ــ میں کسی کو نہیں بتلاؤنگا۔

ناظر صاحب میری پیشانی پر جھکے۔ میں نے ان کے ہونٹوں کی حدت اور آنسوؤں کی نمی دونوں ہی اپنی پیشانی پر محسوس کی۔

پھر وہ اٹھے اور طوفانی بارش میں گرجتے بادلوں میں چمکتی بجلیوں میں اس تیزی سے چل پڑے جیسے ان کے اندر کے طوفانوں کے آگے یہ سب کچھ ہیچ ہو۔



# ادھورا سوئٹر

مونا نے جب مجھ سے یہ کہا تھا کہ کبھی آپ کو مجھ پر بھی کہانی لکھنی ہوگی
تو میں صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

مونا ایک معمولی صورت کی غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت کو پرکشش
بنانے میں اس کی مسکراہٹ اور اس کی چال کو بڑا دخل تھا۔ چلتی اس طرح تھی جیسے
دیکھنے والوں کے دلوں پر قدم رکھ رہی ہو اور مسکراتی اس طرح تھی جیسے پوچھ رہی
ہو کہ کیوں کیسے پامال کر کے رکھ دیا ہے۔
جو لوگ اس کی چال کی زد میں آجاتے وہ اس کی مسکراہٹ کے سہارے
سنبھل بھی جانے کی کوشش کرتے لیکن اپنا توازن کھو بیٹھتے۔ مونا اتنی سفاک بھی نہ
تھی کہ اسے ان ساری باتوں کا علم تک نہ ہوتا۔ وہ بھانپ جاتی لیکن اس حادثے کو اپنی
خوش فہمی سمجھ کر وہ ہر اس پسندیدگی کی نفی کرنے لگتی جو نظروں ہی نظروں میں اسے

پیش کی جاتی۔

"مجھ میں ہے ہی کیا ——— میں کہاں چاہے جانے کے لائق ہوں"۔ وہ آئینہ سامنے رکھ کر سوچتی اور یوں اداس ہو جاتی جیسے اس کی اپنی آنکھیں اس کے حسن کا جائزہ ان نظروں سے کبھی نہ لے سکیں گی جن بیقرار نظروں سے کبھی نہ لے سکیں گی۔ جن بیقرار نظروں سے لفٹننٹ ولید نے ہاتھ پر پٹی بندھواتے وقت آپریشن تھیٹر میں لیا تھا۔

جب پٹی باندھ کر وہ اسے وارڈ میں بستر تک لے آئی تو بستر پر لیٹتے ہوئے ولید نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ"

وہ اسٹول کھینچتے ہوئے مسکرائی تھی اور بیٹھ گئی تھی۔ ولید نے ٹکٹکی باندھ کر منٹ بھر اس کو دیکھا تھا۔ مونا بدستور مسکرا رہی تھی۔

"میرے بچوں کی ماں بنو گی؟" ——— ولید نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا تھا۔

مونا کی مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے گھرتے ہوئے بادلوں میں چاند ڈوبتا ہے۔ وہ اس طرح خاموش رہی جیسے خود کو بت سمجھ بیٹھی ہو۔

بتاؤ مونا ——— ولید اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر اس نے مونا کے دونوں بازوؤں کو اتنی قوت سے دبایا کہ اس کے زخمی ہاتھ کی پٹی میں سے خون رسنے لگا لیکن مونا خاموش رہی۔ جب لفٹننٹ ولید کے ہاتھوں کی گرفت مونا کے بازوؤں پر ذرا کم

ہوگئی کہ مونا رو رہی ہے تو یکایک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تڑپ کر ولید کی گرفت سے نکلی اور اپنی آنکھوں پر دستی رکھ کر تیز تیز دارڈ سے چلی گئی۔

ولید نے چاہا کہ اس کا پیچھا کرے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

"وہ آئے گی"۔۔۔ وہ اپنے بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد اسے پھر انجکشن لگائے گی۔ پگلی کہیں کی۔ ولید نے بڑے پیار سے سوچا پتہ نہیں کیا الٹا سیدھا سمجھ بیٹھی ہے اتنی پیاری پیاری باتیں کرتے کرتے یوں خاموش ہوئی ہے جیسے میں کوئی ناگ ہوں جس نے اس کی چاندنی جیسی مسکراہٹ کو ڈس لیا ہے۔۔۔ لیکن کیا کوئی اس کا منگیتر ہے جس کو وہ چاہتی ہے؟ نہیں یوں ہوتا تو اس کو رونے کی کیا پڑی تھی! تو پھر کیا وہ بیاہتا ہے؟

"اور لفٹنٹ ولید بیقرار ہو اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چپکے سے اٹھ کر نرسز لاؤنج میں پہنچ جائے۔ لیکن وہ وہاں اکیلی نہیں ہوگی"۔۔۔ یہ سوچ کر اس نے کروٹ بدل لی اور اس سمت دیکھتا رہا جس طرف وہ گئی تھی۔ گردن جھکائے دستی آنکھوں پر رکھے۔

یہ ڈیڑھ گھنٹہ ولید نے انتہائی بے قراری کے عالم میں گزارا۔

ٹھیک وقت پر وہ پھر سرنج اور سوئی ہاتھ میں لئے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی۔ خوشی کے مارے ولید کا چہرہ دمک اٹھا۔

جب وہ بالکل پاس آ گئی تو چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر اس نے سرنج کی سوئی کو اوپر اٹھا کر سرنج کا پمپ دبایا اور تھوڑی سی دوا سرنج سے خارج

کر کے ولید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں انجکشن نہیں لوں گا"

نہ لیجئے۔ بلکہ ہو سکے تو ڈی۔ ایم۔ او سے شکایت کر دیجئے کہ نرس بڑی نک چڑھی ہے۔ مسکرانا تو جانتی ہی نہیں۔ دو مہینے کی سروس میں یہ چوتھی شکایت سہی۔ شاید فوجی ہسپتال میں یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

میں تمہارے ڈی۔ ایم۔ او کو کیا جانوں۔ مجھے جو کچھ شکایت کرنی ہے۔ وہ تم ہی سے کرنی ہے۔ مجھے بتاؤ آخر تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔؟

اگر مجھے اس طرح ہر بات کو سچ سمجھنے کی عادت ہوتی تو میں پہلے حادثہ میں آپ سے بہت بڑے فوجی افسر کی کچھ ہو گئی ہوتی۔

مگر یہ زیادتی ہے۔ مونا۔ سچ اور جھوٹ کا فرق کرنے میں جب آنکھیں تک چوک جاتی ہیں تو پھر دل اس فرض کو پورا کرتا ہے۔ تمہیں اب اپنے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ میں سپاہی ہوں میں جانتا ہوں کہ محبت کے اظہار کا بڑا کرڈ طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح طریقہ اظہار کوئی نہیں ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے یہ چاہے کہ وہ اس کے بچوں کی ماں بنے اور پھر تم یہ بھی تو سوچو کہ میرے پاس وقت کہاں ہے۔ کہ میں تمہارے حسن کی تعریف کروں۔ اپنی محبتوں اور وفاؤں کے پے در پے امتحان دوں۔ ایسے تمہارے دل میں اتنی جگہ پیدا کروں کہ مجھے چھوڑتے وقت تمہاری آنکھیں نم ہو جائیں اور جب چھوڑ چکو تو پھر تم سو بھی نہ سکو؟ اس ایک گھنٹہ کی رفاقت میں تم مجھے اتنی پیاری لگی ہو کہ میں وقت ملنے پر تمہارے لئے وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ جو ایک

چاہنے والے سے اس کی محبوبہ چاہتی ہے۔ لیکن مونا میں محاذ سے لوٹا ہوا سپاہی
ہوں۔ میں بڑا بے بس تھا۔ جس وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ آیا ہوں۔ سپاہی
کے لئے اس کے ہاتھ اور اس کی آنکھیں سب سے زیادہ اہم ہیں تاکہ وہ آخری
سانس تک دشمن سے لڑ سکے۔ کل پھر مجھے اسی ہاتھ کی توانائی کا امتحان لڑائی کے
محاذ پر لینا ہے جس ہاتھ نے تمہیں گرفت میں لینا چاہا تو اس سے خون رس رہا تھا۔

مونا نے اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر لفٹننٹ ولید کو غور سے دیکھا "تو کیا
آپ واقعی مجھ کو اپنے قابل سمجھتے ہیں"۔

مونا یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیئے تھا کہ کیا تم مجھے اپنے قابل نہیں
سمجھتی ہو جو اس طرح پس و پیش کر رہی ہو؟۔

"لیکن" ــــــ

میں جانتا تھا کہ تم اس دیوار کی بات اٹھاؤ گی جس کو ہم نے اپنے ہاتھوں
سے اینٹ اور گارا دیکر اونچا کر لیا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھو مونا کہ نہ تو کسی
محبت کا کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کسی سپاہی کا۔ وہ شئے جو موت کو زندگی کا ایک
کھیل تصور کرتی ہے وہ بھلا ان چھوٹی چھوٹی دیواروں سے رکے گی؟۔

مونا نے اب کی بار ایسی نظروں سے ولید کو دیکھا کہ اس کا پیار چھپائے
نہ چھپتا تھا۔ اچھا اب انجکشن تو لگوا لیجئے مونا نے ولید کا بازو تھامتے ہوئے
کہا۔

"نہیں ــ پہلے میری بات کا جواب دو"

ولید نے بازو جانتے ہوئے بھی چھڑا لیا کہ مونا ہنس رہی ہے اور یہی

ہنسی وہ شئے تھی جس کے لئے وہ مضطرب تھا۔ آج سے آپ کی ضد نہیں میرا حکم چلے گا۔

"سچ"! ۔ ولید نے قریب قریب بستر پر اچھل کر پوچھا اور جب مونا اس کے قریب آ گئی تو اس نے پلنگ پر بیٹھتے بیٹھتے اپنا سر مونا کے سینے پر رکھ دیا اور جب مونا نے اسے انجکشن لگایا تو وہ مونا کی محبت کے آگے بالکل بچہ سا معلوم ہو رہا تھا جیسے مونا کی محبت میں شفقت کا بھی عنصر شامل ہو۔

دو دن بعد لفٹنٹ ولید کو ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا کیونکہ وہ تندرست ہو گیا تھا۔ مونا کی دو روز کی رفاقت نے لفٹنٹ ولید کے سینے میں ولولوں کا ایسا جوالا مکھی بھر دیا تھا۔ اس نے جب بھی مونا کی پیشانی کو چوما مونا نے اپنے سہاگ کو دعائیں دیں کیونکہ مونا نے ولید کو اب اپنا سب کچھ مان لیا تھا اور اس محاذ پر واپس چلے جانے کے تصور سے ہی کانپ کانپ جاتی تھی۔ اس خوف کو اس نے سو سو طرح ولید سے چھپایا لیکن باتیں کرتے کرتے بار بار اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

ولید اسے تسلیاں دیتا۔ کل تم ایک بہادر سپاہی کی بیوی بن جاؤ گی مونا اور پھر اس کے بچوں کی ماں تمہیں یہ آنسو زیب نہیں دیتے۔ ہنسی خوشی اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال کر جھول جانا۔ میں ان ہنستے ہوئے ہونٹوں کی چاندنی چرا کر اپنے پاس محفوظ کر لوں گا تاکہ محاذ جنگ پر جب بھی اندھیرے بڑھیں یہ چاندنی مجھے راہ دکھلائے۔ اور وہ مونا کو اس اس طرح گدگداتا کہ وہ ہنس پڑتی۔

میں نے مونا کو پہلی بار ولید کے مکان پر اس وقت دیکھا جب وہ سُرخ لباس پہنے ولید کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے موٹر میں سوار ہو رہی تھی۔ ولید ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں تھا اور بڑا سجل لگ رہا تھا۔ وہ ویسے بھی بے حد وجیہہ اور خوبصورت نوجوان ہے جب اس نے مجھے دیکھا تو آگے بڑھ کر چمٹ گیا۔

"کہاں رہے میرے افسانے" ۔ کل ہم دونوں ہی دو بار تمہارے کمرے پر ہو آئے میں نے جھلا کر مونا سے کہا کہ کچھ نہیں تو یہ قفل توڑتا چلوں۔ مونا نے روک دیا ورنہ ۔ اچھا بھئی پہلے مونا سے مل لو۔ میں نے ہاسپٹل سے یہ کہانی پلک جھپکتے میں یوں چٹکی بجا کر اٹھا لی ہے۔ اس نے چٹکی بجا کر مونا کو میرے قریب کر دیا اور پھر مونا سے کہنے لگا۔ "یہ ہے میرا وہی دوست نندو جسے میں افسانہ کہتا ہوں۔ اور جس کے لئے میں کل اس قدر بیقرار تھا کہ ہماری خوشی میں شریک ہوسکے۔ لیکن اس کے پیر میں تو چکر ہے۔ جانے کہاں کہاں کہانی کی تلاش میں بھٹکتا ہے۔ اور مجھے دیکھو کیسا چپکے سے اتنی پیاری سی کہانی چرا لایا ہوں۔

مونا نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ مونا ولید احمد جو کبھی مونا جوالا پرشاد تھی۔ شاید اس کی مسکراہٹ ہی نے ولید کو مارا ہوگا۔ ویسے اچھی بھلی ہے۔ لیکن ولید کی شریک حیات کو تو بے حد حسین ہونا چاہیئے۔ میں نے دل ہی دل میں ولید کی جلد بازی کو محسوس کیا۔

"اچھا تو تم لوگ وہاں ہو آؤ جہاں کے لئے تیار ہو کر نکلے تھے۔ میں پھر آؤں گا"۔

آج رات تم ہم سے پھر ملو گے ۔" ولید نے گویا حکم صادر کر دیا۔" میں
مونا کو ان کے دو ایک رشتہ داروں سے ملا آؤں میرا تو اس شہر میں کوئی ہے ہی نہیں۔
تم ہی اس وقت میرے دوست اور سرپرست دونوں ہو۔

میں نے موقع کو غنیمت جانا اور تن گیا۔ تو پھر تمہیں اپنے سرپرست سے
بات کرتے وقت آداب و تمیز کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ولید نے مسکرا کر ہاتھ جوڑ لئے ۔آپ رات کو ضرور تشریف لائیں۔
کہنی مار کر اس نے مونا کو بھی اشارہ کیا ۔مونا نے بھی مسکرا کر ہاتھ جوڑ لیے
کہنے لگی ۔ہم دونوں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے۔

میں نے بڑی تمکنت کا مظاہرہ کیا اور ہم جدا ہو گئے۔

رات کو میں جب وعدہ کے مطابق پہنچا تو ولید کے کوارٹر کو تالا لگا ہوا
تھا ۔میں نے سوچا کہ شاید یہ لوگ ابھی لوٹے نہیں ہیں۔

لیکن جب میں لوٹنے لگا تو ایک فوجی سپاہی نے مجھے بتایا کہ دونوں
ارجنٹ آرڈر کی بناء پر انبالہ چلے گئے ہیں۔

دوسرے ہی دن مجھے ولید کا خط ملا۔ اپنے اس طرح یکایک چلے جانے
پر اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ آج کے آٹھویں روز محاذ
پر چلا جائے گا اور محاذ پر جانے تک وہیں انبالہ میں رہے گا کیونکہ ابھی اس کے ہاتھ کا زخم
پوری طرح اچھا نہیں ہوا ہے۔ اور اس کو اپنے ملٹری ہیڈ کوارٹر سے کچھ ضروری ہدایتیں
بھی لینی ہیں۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد مونا وہیں آجائے گی
اور کوارٹر میں رہے گی۔ مجھے ہدایت کی تھی کہ اس کی خبر گیری کروں ۔ اور روز

اس سے ملتا رہوں۔

میں نے کامیاب اور فتح مند لوٹنے کے لئے اپنی نیک تمنائیں لکھیں اور وعدہ کیا کہ مونا کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

اس کے بعد مجھے ولید کی کوئی اطلاع نہیں ملی نہ ہی اس نے کوئی خط بھیجا۔ نویں دسویں دن جب میں اس کے کوارٹر میں پہونچا تو مونا موجود تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسی صبح آئی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ولید محاذ پر چلے گئے ہیں۔ اس کی آنکھیں شاید دن بھر رونے کے باعث سوج گئی تھیں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کھو جاتی۔ کہنے لگی آپ کے ولید نے مجھ سے جدا ہوتے وقت مجھے نوچ کیا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو بے ساختہ ہنس پڑے اور مجھے گد گدا کر ہنسایا۔ میرا چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں لیکن رونا بھی بس میں نہ تھا۔ آنسو آنکھوں میں آ آکر سہم جاتے تھے۔ رونا بُرا شگون ہے نا۔ میرا جیالا سپاہی تو جیت کر سینہ تانے سر اٹھائے خوشی خوشی گھر آئے گا۔ پھر یہ آنسو کیسے ہیں؟ کیسی بلا ہے جو آنسو بھی چھین لیتی ہے۔ مسکراہٹ بھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

ارے آپ کھڑے ہوئے ہیں۔ بیٹھ جائیے نا۔ مجھے معاف کر دیں دراصل ولید کے۔ پھر وہ خود ہی شرما گئی۔ اور کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ وہ کہتے تھے کہ آپ بڑے گیانی ہیں۔ کوئی پریشانی ہو تو میں آپ سے مشورہ کروں۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں میں تو ولید کی بیوی ہوں۔ جن پر مجھے فخر ہے۔ یہ جنگ بہت جلد ہی رک جائے گی نا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ کچھ سوچ کر ہنس پڑی۔ پھر خود ہی کہنے لگی وہ بڑے کھلنڈرے ہیں بڑا بچپن ہے ان میں۔ ان آٹھ دس دنوں میں مجھے بڑا تنگ کیا حکم دیتے کہ مارچ پاسٹ کروں ——— آپ کو پتہ ہے یہ کس بات کی سزا تھی؟ کہتے کہ تمہاری چال مجھے پیاری لگتی ہے پھر شاید اس نے سوچا کہ میرے سامنے اسے ایسی بات نہیں کرنا چاہیئے اور وہ خود کچھ اس طرح شرمائی جیسے شرم بھی چھپا رہی ہو۔

"چائے بنا لاؤں" ——— وہ اٹھی اس کی چال میں بڑا بانکپن تھا۔

جب وہ کچن میں چلی گئی تو میں نے بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسٹیل کے ایک خوبصورت کتابی چوکھٹے میں ولید کی اور مونا کی تصویریں سجی ہوئی میز پر دھری تھیں۔ پھر میری نظر شیشے کی اس الماری پر پڑی جس میں ولید اور مونا کے کپڑے مونا نے بالکل نئے ڈھنگ سے جما رکھے تھے۔ ولید کا ہر کپڑا مونا کے کپڑوں کے ساتھ جوڑ کر تہہ کیا گیا تھا۔ کوئی الگ نہ تھا۔ میں اس کے پیار پر مسکرا کر رہ گیا۔ مجھے مونا بڑی پیاری لگی جس نے ولید کو اپنے دل میں سو سو طرح چھپا کر رکھ لیا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر میز پر پڑا ہوا البم اٹھا لیا۔ پہلی ہی تصویر میں جاتے ہوئے سپاہی کو اس کی محبوبہ روک رہی تھی اور سپاہی مسکراتا ہوا ہندوستان کے نقشے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جو اس کی پشت پر ٹنگا تھا۔ یہ سپاہی ولید تھا اور یہ محبوبہ مونا۔ تصویر میں محبوبہ کا اداس چہرہ اور سپاہی کی پیار بھری مسکراہٹ اور بیک گراؤنڈ میں ہندوستان کا نقشہ بہت

پُراثر تھے۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر البم رکھ دیا کہ مونا کے بتانے تک مجھے اس کی غیر موجودگی میں اس کا البم نہیں دیکھنا چاہیئے۔

میں چپکا سا آ کر اپنی جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ وہ ٹرے میں چائے نمکین بسکٹ اور بوندیاں لے آئی۔

چائے کے ساتھ جب اس نے یہ لوازمات پیش کئے تو مجھے ولید بے اختیار یاد آیا۔ میں لمحہ بھر کو مبہوت سا ٹرے کو تکتا رہا۔

"میں جانتی ہوں اس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں" اس نے مسکرا کر کہا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ مرجھا گئی تھی۔ مجھ سے ولید نے آپ کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ ہم شاپنگ کر رہے تھے تو یہ نمکین بسکٹ اور بوندیاں انہوں نے ہی مجھے دلائیں۔ کہنے لگے۔ نندو بھیّا جب بھی آئیں چائے کے ساتھ یہ بھی پیش کروں۔

ولید کا دل کتنی ہی محبتوں کی ایک دنیا بسائے ہوئے ہے۔ میں نے یہ جملہ کہتے ہوئے اپنی از خود رفتگی کو چھپالیا جو الفاظ اور لہجے سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ اور خود کو سنبھال کر بے وجہ ہنس پڑا۔

"کیا بات ہوئی اس نے پوچھا"

"بہت خاص بات ہوئی ہے"

"پھر بتائیے نا"

میں نے تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ الماری میں کپڑے رکھنے کا انداز دنیا بھر سے انوکھا ہے۔

وہ کچھ شرما کر ہنس پڑی ۔ کہنے لگی ۔ دیکھئے نا ۔ میرے کپڑے، میری تصویر مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہیں ۔ ہر ایک ساجن کے پاس ہے ۔ میں اکیلی ان سے بچھڑ کر رہ گئی ہوں مجھے تو یوں لگتا ہے ۔ جیسے میں نے جی بھر کر ولید کو دیکھا بھی نہیں ۔" اُس کا گلا رندھ گیا تھا ۔ وہ جو ابھی ابھی ہنس پڑی تھی ۔"

اُس نے کہا ۔ "مجھ پر بھی کہانی لکھیئے ۔"

میں مسکرا دیا ۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مونا کو میں نے بہلایا ۔ اس کو مشورہ دیا کہ وہ کل سے ڈیوٹی پر جانے لگے تاکہ مصروفیت میں اُس کا دل بہلا رہے ۔

" وہ تو میں ضرور جاؤں گی ۔" مونا کہنے لگی ۔ ولید نے تاکید کی ہے کہ میں زخمی فوجیوں کی دیکھ بھال من لگا کر کروں ۔ انہوں نے جاتے وقت مجھ سے جو آخری بات کہی وہ تھی بھیّا کہ ۔ مونا دعا کرنا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک پرم ویر چکر ولید احمد کے نام بھی عبدالحمید خاں کے ساتھ شامل ہو جائے ۔

کچھ دیر بعد میں مونا سے رخصت ہو کر چلا آیا ۔

چار روز تک میں مسلسل ولید کے کوارٹر جاتا رہا کہ مونا کے احوال پوچھوں لیکن معلوم ہوا کہ وہ کبھی بڑی رات کو لوٹ آتی ہے ۔ کبھی نہیں آتی ہے ۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ہسپتال میں ہی رہ رہی ہے ۔ سیالکوٹ اور لائیلپور سکٹر پر گھمسان لڑائی کی اطلاعیں اخباروں میں آرہی تھیں ۔ ولید کی، کوئی خبر نہیں تھی کہ وہ کس محاذ پر ہے ۔ چار دن تک مونا سے ملاقات نہ ہوئی تو میں پانچویں دن فوجی ہسپتال پہونچا ۔ اندر داخل ہونے پر پابندیاں تھیں ۔ ولید اور مونا کے نام سے وہاں کام بن گیا ۔ لیکن مونا کی ساتھی نرسوں نے بتلایا کہ لفٹننٹ ولید کے بے جگری اور بہادری سے لڑتے ہوئے شہید

ہو جانے کی خبریں عام تھیں۔ مونا کی حالت غیر تھی۔ وہ صحیح معلومات حاصل کرنے جانے کہاں کہاں گئی تھی۔

میرے دل پر کسی نے جیسے بھاری سی پتھر کی سل رکھ دی تھی۔ مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ اب تو لڑائی بند ہونے والی تھی، میں ٹیکسی لیکر سیدھا کوارٹر پہونچا تو کوارٹر بند تھا۔ میں اپنے کمرے پر آیا کہ شاید مونا وہاں آئی ہو۔ لیکن وہ وہاں بھی نہ تھی۔ مجھ سے ایک جانے پہچانے آدمی نے پوچھا۔ "نندنی کہانی کار آپ ہی ہیں" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے تار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

فوجی محکمے نے مجھے خبر دی تھی۔ "لفٹنٹ ولید زندہ ہیں۔ شدید زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن اب کوئی خطرہ نہیں، وہ یقیناً بچ جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں آپ مونا کے پاس رہیں"۔

ولید مجھے بڑا بھائی اور سرپرست مانتا تھا اور اسی لئے اس نے فوجی ریکارڈ میں بھی اپنے قریب ترین رشتہ دار کے طور پر میرا ہی نام لکھوا رکھا تھا۔ شادی کے بعد اسے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ میری جگہ اب مونا کا پتہ لکھوایا جاتا۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے احساس ہوا کہ ٹیکسی چھوڑ کر میں نے غلطی کی ہے۔ اب یہاں دور تک ٹیکسی اسٹینڈ نہیں تھا۔ فاصلہ لمبا تھا۔ میں نے پھر ولید کے کوارٹر کا رخ کیا۔ رکشا پر پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ میں بے تحاشہ لپک کر کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ میں مونا کو پکارتا ہوا اندر ہاتھ میں تھامے برآمدے سے کمرے میں پہونچا۔ وہ اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی میرا ماتھا ٹھنکا۔ مونا اس وقت نہیں سو سکتی۔ میں قریب پہنچا۔ سرنج نیچے پڑی ہوئی تھی اور

سرنج کی سوئی مونا کی رگ میں پھنسی ہوئی تھی اس نے مارفیا اپنی رگ میں داخل کر لیا تھا اور ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔ سرنج کے پاس ایک کاغذ پڑا تھا۔ میں نے اٹھالیا لکھا تھا نند و بھیا۔ اپنے ولید کے پاس جا رہی ہوں ولید کی لاش ملے تو ان کی قبر میری سمادھی کے برابر بنانا۔ یہ میری آخری اچھا ہے۔

میں نے آہستہ سے مونا کی رگ میں پھنسی ہوئی سوئی نکال دی۔ جو شاید پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے نہیں نکالنی چاہئیے تھی۔ لیکن میں اپنے ولید سے کیسے کہتا کہ میں نے مونا کی خبر گیری کی ہے۔

اس کے پلنگ کے برابر صوفے کے ہتھے پر ٹکا ہوا میں سوچ رہا ہوں کہ وہ کہانی کس طرح شروع کی جائے جو اب ختم ہو گئی ہے۔

صوفے پر اولن کے ننھے منے موزے اور لمبی لمبی سلائیاں چھوٹے سے نامکمل سوئٹر میں دھنسی پڑی ہیں۔ میرے ہاتھ میں ولید کا تار بھی ہے۔ مونا کا آخری خط بھی اور باہر کوئی ہاکر کسی اخبار کا ضمیمہ بیچتا ہوا۔ پکار رہا ہے کہ آج ساڑھے تین بجے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ بند ہو گئی۔

— —

# ایک خط یادوں کے نام

## میری اپنی ذکیہ

اس وقت جب کہ میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں آدھی رات گزر چکی ہے۔

باہر کھوپویں بارش ہو رہی ہے اور کھڑکیوں کے ٹین شیڈس پر اس پھوار کی آواز اتنی تیز بھی نہیں ہے جو کمرے میں ٹک ٹک کرتی گھڑی کی آواز پر فتح پالے اور مجھے پل پل اڑتے ہوئے وقت کے تصور سے آزاد کر دے ــــ کب سے سوچ رہی ہوں تمہیں کچھ لکھوں گی ــــ دن مہینوں میں تبدیل ہوئے اور مہینے برس بن گئے ــــ تم بھی ایک ہی بے دفا نکلیں ــــ اپنی ساحرہ کو کبھی یاد کیا ہوتا ــــ

تم سے جدا ہوئی تھی تو تم نے گڑیوں کے گھروندے یہ کہہ کر رکھ لئے تھے کہ مجھے اپنے ننھوں ہی کو بہلانے کھلانے سے فرصت نہیں ملے گی میں بھلا ان گھروندوں کی کہاں حفاظت کر پاؤں گی ــــ سو وہ تو ٹھیک ہی ہوا ــــ میں نے بھی سوچا تھا کہ اپنا کمرہ جو

اپنی چھوٹی سی دنیا کے لئے مختص تھا، جُوں کا تُوں سجا رہے گا ـــــ میں کبھی جب کبھی تم سے ملنے آؤں گی اس چھوٹی سی دنیا کے ہر ایک ساتھی سے پوچھوں گی کہ عمر کے چودہ برس ساتھ گذارنے کے بعد وہ مجھے بھلانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے ـــــ لیکن اب آؤں بھی تو کسی سے بھلا کچھ پوچھ سکوں گی؟ جب تمہیں نے یادوں کے دیئے بجھا دیئے ہیں۔

خیر ذکی چھوڑو بھی، میں تو خود کو یہ سمجھا کر تسلّی دے لوں گی کہ تم یونیورسٹی کورس کے آخری سال میں ہو ـــــ تمہیں اپنی کتابوں سے فرصت ہی نہیں ملتی ہوگی ورنہ میری ذکی بھلا مجھے بھول سکتی ہے! دیکھا تم نے ـــــ اب میں یادوں کے کھنڈر میں کہاں تک نکل آئی ہوں ـــــ تم مجھے بھول گئیں لیکن میں خود جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا رہی ہوں ـــــ اس فریب کھانے میں کیسا کیسا سکھ ملتا ہے ـــــ آنند ملتا ہے ـــــ ایسے میں بھلا کیسے مان لیتی کہ تم مجھے بھلا بیٹھی ہو ـــــ

جینے کا قرینہ کوئی ہم بیاہتا عورتوں سے سیکھے ـــــ جو اپنا ہے سو اپنا ہے ہی ـــــ اور جو اپنا نہیں ہے سو بھی اپنا ہی سمجھ بیٹھے ہیں ـــــ تب ہی تو کہیں گھر بستا ہے۔

سوچتی ہوں ذکی تجھ سے کتنی ہی باتیں کر لوں ـــــ پتہ نہیں پھر کبھی وقت ملے نہ ملے۔

باہر بارش تیز ہو گئی ہے اور کھڑکیوں کے ٹین شیڈس پر اس کی آواز مجھے اکھرنے لگی ہے۔ کبھی کبھی یہ آواز اتنی بری بھی نہیں لگتی ـــــ نیم خوابی کے عالم میں تو جیسے کوئی جلترنگ سے چھیڑ دیتا ہے اور یہی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ لیکن جانے کیوں یہ آواز بھی اب مجھے نہ بھائی۔ شاید اسی لئے میں جاگ کر

رہی ہوں ــــ ذکی تو نے کیوں یہ بات سوچی ہو گی کہ اکیلے جاگتے رہنے میں
رات کے سناٹے بولنے لگتے ہیں اور جب گھڑی کی ٹِک ٹِک سے ٹوٹتے ہیں تو
مانو یادوں کی کرچیاں چیاں سی بکھر جاتی ہیں جنھیں ہم چُن بھی نہیں پاتے، بس دیکھتے
رہ جاتے ہیں ــــ زندگی میں اکیلے جاگتے رہنا کتنا مشکل ہے ــــ خدا نہ کرے
جو کبھی تیری سمجھ میں یہ بات آسکے۔

میں تو تجھ سے یہ کہنے چلی تھی کہ میرے کمرے کی اس ٹک ٹک کرتی
ہوئی گھڑی کو کوئی خاموش کر دے ــــ اور اب جبکہ ٹین شیڈس پر بارش کی
آواز نے شور مچا کر گھڑی کی اس ٹِک ٹِک کو میرے کمرے سے نکال دیا ہے تو
میں بوکھلا گئی ہوں حالانکہ وقت ٹھہر نہیں گیا ہے وہ کہاں کسی کا انتظار کرتا ہے ــــ
لیکن وہ جو میں نے اپنے سینے کے اندر دل کے نام سے ایک گھڑی چھپا رکھی ہے۔
اس کے چلنے اور بند ہونے تک میں اکیلی ہی جاگتی رہوں گی ــــ گو میں تھک گئی ہوں
گی ــــ گو میں تھک گئی ہوں ــــ واقعی تھک گئی ہوں ذکی۔

اپنی ہستی دوسروں پر نچھاور کرنے میں بھی کیسے کیسے مزے ملتے ہیں ــــ
سب کچھ پرایا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا آپا بھی پرایا ــــ میں ذات سے جیسے کچھ ہوں
ہی نہیں ــــ دوسروں کے لئے سب کچھ ہو جانا اور اپنے لئے کچھ بھی نہ رہنا کوئی
اس دھرتی سے سیکھے جس کا سینہ چیر کر بیج بونے پر کونپلیں پھوٹتی ہیں، فصلیں
لہلہاتی ہیں ــــ میں بھی بس دھرتی بن گئی ہوں ذکی ــــ روند کر کوئی چلتا
ہے تو آواز نہیں کرتی۔ جھک کر کوئی اٹھا سکتا ہے تو اوپر نہیں اٹھ جاتی۔

لو ــــ ذرا اس ننھے کو تھپک کر سلا دوں، ذرا اس کی آنکھوں

میں پھر سے نندیا گھلا دوں تو تم سے باتیں کروں ــــ ابھی ابھی مشکل سے اس کو سلا سکی تھی - یہ بڑا ضدّی ہے - مجھے بہت تنگ کرتا ہے - رو رو کر خود بھی ہلکان ہوتا ہے ــــ میرا گوشت پوست میرا لہو، میرا سُکھ چین، میری نیند غرض کہ میرا وجود تو بس اس کا ہو کر رہ گیا ہے ــــ گویا میں اپنی بقیہ نصف ہستی دوسروں میں تقسیم کرتی پھر رہی ہوں ــــ یہ دوسرے بھی کون ہیں ــــ میرے اپنے ہی تو ہیں ــــ میری جو بیٹیا ہے نازِکی، اس میں پھر اتنی سمجھ ہے کہ چھوٹے بھائیوں پر نچھاور ہوتی ہوئی محبت کو محسوس کرتی ہے تو برہم نہیں ہوتی ــــ بلکہ کبھی کبھی خود بھی اس ننھے ضدی کو پچکار لیتی ہے ــــ یا شاید یہ بھی اس لئے ہے کہ اس نے عورت کا جنم لیا ہے ــــ لیکن اس ننھے سے جو بڑا ہے وہ تو بعض وقت جلاپے میں میری گود سے ننھے کو کھینچ لیتا ہے ــــ میری نظر بچا کر اُس کی ٹھکائی کر دینے سے بھی نہیں چوکتا ــــ خود مجھ پر بھی تو ننھے ننھے ہاتھوں سے ماروں کے پھول برس جاتے ہیں اور میں ان ہاتھوں کو چوم چوم کر رہ جاتی ہوں ــــ یہ برہمی دراصل احتجاج ہے کہ میری وہ محبتیں جس کا یہ ضدّی ننھا بلا شرکتِ غیرے مالک بن بیٹھا ہے اُس میں اس کا اپنا بھی تو حق ہے اور میں گویا حقوق کا تحفظ نہیں کر رہی ہوں۔

تمھیں ایک دلچسپ بات سناؤں ــــ شاید تم ہنس پڑو گی یہ محبتیں حاصل کرنے میں سبقت لے جانے کی دوڑ شاید آدمی کی فطرت ہے - کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ خود وہ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں ــــ اس خفگی اور ناراضگی کا سبب جانتی ہو کیا تھا ــــ یہی کہ میں بالکل بچوں کی ہو رہی ہوں اور اُن کی طرف توجہ کم کرتی ہوں ــــ گویا وہ بھی اس مقابلے کی دوڑ میں بٹیا اور منجھلے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتے ــــ جب

ان کے تیور اس طرح دیکھتی ہوں تو سب کو چھوڑ کر ان کی دلداری کرتی ہوں۔
میں کبھی کبھی سوچتی ہوں ذکی کہ اپنی ہستی کو امڈتے ہوئے بادل کی طرح بنا لینا ہی شاید عورت پن ہے — پودوں کو دھوپ جھلس رہی ہو تو سایہ بن گئے اور اگر ان کی جڑیں سوکھ رہی ہوں تو برس پڑے۔ اب اس برسنے میں یہ تخصیص تو ممکن نہیں نا کہ کس ننھے پودے کی قسمت میں کتنا جل آ گیا ہے اور کس تناور درخت کے حصے میں کتنا پانی۔

اب تم کو خط لکھ کر پڑ رہوں گی۔ پتہ نہیں تم جواب دو گی بھی یا نہیں — جو بھی رات کی رات مجھے تمہارے اپنے بارے میں سوچ لینے دو — صبح ہو گی تو پھر مجھے فرصت کہاں رہے گی — سورج کی کرنیں میری زندگی میں اجالے کے ساتھ ساتھ اتنی مصروفیتیں بھی لے آتی ہیں کہ میں مشین بن جاتی ہوں — رات ہوتی ہے اور ننھا ہلکان کر کر کے سو جاتا ہے تو پھر رات گئے کوئی گوشت پوست کی عورت میرے وجود میں بیدار ہوتی ہے اور وہی بانہہ پکڑ کر مجھے تجھ بے وفا تک لے جاتی ہے اور میں تجھ سے میلوں دور رہ کر بھی پیر دبا کر جب تیرے کمرے میں پہنچتی ہوں تو، تو مدماتی نیند کی آغوش میں ایسی بے سدھ ہوتی ہے کہ نہ تجھے اٹھائے بنتی ہے نہ تجھ سے بات کئے — میں گھر بھر میں گھوم پھر کر ایک ایک چیز کو دیکھ کر لوٹ آتی ہوں — کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے — کسی نے — کسی نے مجھے پہچانا نہیں — اب یوں بھی ہو جائے تو کیا تعجب ہے — سوچ تو بھلا — کیا بیت جاتی ہو گی۔
سو سو بہانے کر کے بھی کسی کو دل سے نہ نکال سکے — جتنا بھلانا چاہا اتنے ہی مجبور ہو گئے — تھک ہار گئے تو بوجھل قدموں سے وہاں تک جا پہونچے کہ چلو ذرا کی

ذرا دیکھ آئیں کہ اسی درشن کے سہارے باقی زندگی بتائیں گے ـــــ اور جب سامنے پہنچے ہیں تو کسی نے اس طرح دیکھا جیسے کہیں دیکھا تھا ـــــ اور ـــــ اور آگے بڑھ گیا ـــــ اُف ـــــ اس کے بعد زندہ رہنا کوئی آسان بات ہے ڈِکی۔ اسی لئے تو میں تجھ تک آنے سے ڈرتی ہوں ـــــ زندگی کیسے پیاری نہیں ہوتی جان، اور پھر میں تو وہ عورت ہوں جو لُٹ چکی میری اپنی زندگی، میری اپنی ہے ہی کہاں ـــ یہ ضدی ننھا اس کا مالک ہے، ٹھکائی کرنے والا منجھلا اس کا مالک ہے، میٹ میٹ تکنے والی بٹیا اس کی مالک ہے اور ہمارے لئے دن رات محنت کرنے والے وہ، اس کے مالک ہیں ـــــ اپنا کچھ بچ رہے تو اسے سو سو جتن سے چھپا کر تجھ تک لے آؤں بھی تو وہ اتنا بھی نہیں ہے کہ کسی خالی جھولی کے کونے ہی کو پُر کرسکے۔ اب ایسے میں وہ چیز جو کسی خالی جھولی کے قابل بھی نہیں ہے۔ تیرے خزانے میں بھلا نظر بھی آسکے گی ؟۔

لے یہ گھڑی کی ٹِک ٹِک پھر مجھے ستانے لگی ـــــ ٹین شیڈس خاموش ہیں۔ بارش تھم چکی ہے۔ ننھا سو رہا ہے گھر کا گھر جیسے نیند کی آغوش میں ہے۔ میرے قدم پھر تیرے آنگن تک مجھے لے آئے ہیں، ننھا میری گود میں ہے اور میں بیچ آنگن میں کھڑی سوچ رہی ہوں ـــــ وہ جو کمرہ ہے، جس کی کھڑکیوں کے مہین پردوں سے ہری ہری روشنیاں چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہی ہیں، اس کمرے میں چپکے سے داخل ہوجاؤں اور تیری بھابی کے پہلو میں ننھے کو سُلا کر دبے پاؤں واپس لوٹ آؤں۔

اور اگر ایسے میں وہ جاگ کر مجھ سے پوچھے تو اسے بتا دوں کہ

تمہارا شوہر جھوٹ کہتا ہے ـــــ میں جانتی ہوں ـــــ میں جانتی ہوں ـــــ
اُسے تو ٹوکریوں بچوں کی خواہش تھی ـــــ تم اس ننھے ہی کو رکھ لو۔
ـــــ اور اگر ذکیؔ، تیری بھابی پوچھ بیٹھے کہ بتاؤ کیا قیمت لوگی تو میں کیا
کہوں گی ـــــ تو ہی بتا، میں کیا کہوں ـــــ

میں کہوں گی ـــــ میں کہوں گی ـــــ اپنی اتنی ساری کاروں میں
سے کسی کار میں بٹھا کر مجھے خوب، گھماؤ، پھر آؤ ـــــ میں تھک گئی ہوں ـــــ بہت
تھک گئی ہوں۔ جب ذرا ماندگی کم ہو، تھکن دُور ہو تو کسی نامعلوم موڑ پر مجھے اُتار دو
ایسے موڑ پر جہاں سے راستے ملیں نہیں ـــــ ڈھونڈنے میں عمر کٹ سکے۔

لے اب میں چلتی ہوں ـــــ رات بہت بیت چکی ہے ـــــ ننھا
جاگ گیا ہے ـــــ تو اس خط کی رسید مجھے دے گی نا ؟ ـــــ کیونکہ اب
میں تجھے پھر کبھی کچھ نہیں لکھوں گی ـــــ یہ خط تیری اپنی مرحوم ساحرہ کا پرسہ
بھی ہے۔

اِدھر آ ـــــ ذرا اور قریب آ ـــــ اور قریب ـــــ تجھے بتا دوں،
کل میں نے تیرے بھیا کی تصویر جلا دی ہے ـــــ ہاں ـــــ
جلا دی ہے ـــــ بٹیا بڑی ہو رہی ہے ـــــ اب میں کہاں اس تصویر
کی حفاظت کر سکوں گی ـــــ اچھا چلوں اب ـــــ ہمیشہ تیری اپنی ساحرہ

ـــــ

# تعارف نامہ

| | |
|---|---|
| نام :- | سید مسیح الدین |
| عرف :- | اقبال |
| تخلص :- | اقبال متین |
| والد کا نام :- | سید عبد القادر صاحب (مرحوم) |
| تاریخ پیدائش :- | ۲/ اکتوبر ۱۹۲۴ء |
| مقام پیدائش :- | فرحت منزل، رام کوٹ، شہر حیدرآباد (بھارت) |
| تعلیم :- | انٹرمیڈیٹ |
| درس گاہیں :- | مدرسہ وسطانیہ بشیرآباد (ناندیڑ) |
| | مدرسہ فوقانیہ چیتاپور |
| | سٹی ہائی اسکول حیدرآباد |
| | ایم۔اے۔او۔ انسٹیٹوٹ، عابڈس، حیدرآباد |
| | سٹی کالج حیدرآباد |
| | دارالعلوم کالج حیدرآباد |
| | چادرگھاٹ کالج حیدرآباد |

پہلی کہانی :- چوڑیاں - ادبِ لطیف، لاہور جون ۱۹۴۵ء
پہلی نظم :- کب تلک - سب رس، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
پہلی کتاب :- اُجلی پرچھائیاں - ۱۴ افسانے - اگست ۱۹۶۰ء

## مطبوعہ تصانیف

(۱) اُجلی پرچھائیاں (افسانے) ۱۹۶۰ء
(آندھرا پردیش ہندی ساہتیہ اکاڈمی اوارڈ)

(۲) بکھا ہوا البم (افسانے) ۱۹۹۳ء (اتر پردیش اردو اکاڈمی اوارڈ)

(۳) چراغِ تہہِ داماں (ناول) ۱۹۷۶ء
حیدرآباد کے سرکردہ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانشوروں کی جانب سے ۲۵/دسمبر ۱۹۷۷ء کو لائبریری ہال انوارالعلوم کالج حیدرآباد میں ناول کی پذیرائی میں خیر مقدمی جلسہ کیسۂ زر کی پیشکشی اور آندھرا پردیش اردو اکاڈمی کی دھاندلی پر احتجاجی تقاریر کہ مجلس کے بورڈ نے اس ناول کو UNIQUE قرار دے کر انعام اول کے لئے نامزد کیا - لیکن اربابِ نظم و نسق نے فحش قرار دیکر انعام سے محروم رکھا - پروفیسر عالم خوندمیری کا احتجاجاً استعفاء - ہندوستان کے بیشتر ادبی جرائد میں احتجاجی اداریئے اور مضامین -

(۴) خالی پٹاریوں کا مداری (افسانے) ۱۹۷۷ء
(آندھرا پردیش اردو اکاڈمی ا

(۵) آگہی کے ویرانے (افسانے) ۱۹۸۰ء
(اتر پردیش اردو اکاڈمی ا

(۶) مزبلہ (افسانے) ۱۹۸۹ء
شائع کردہ آندھرا پردیش
• ادبی خدمات کے اعتراف
شاعروں اور دانشوروں کی جا
تقریب، تقاریر اور گراں قدر ک
۹/دسمبر ۱۹۸۹ بہ مکان محمد ع
مہدی پٹنم۔ حیدرآباد (بہ
• ادبی ٹرسٹ کا تحفۂ اعتر
• اتر پردیش اردو اکاڈمی ا

(۷) میں فسانہ تم بھی کہانی (افسانے) دسمبر ۱۹۹۳

## اِن کے علاوہ توصیف نامے (اسنادات)

★ اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنو۔ سند اور رقم (۳۰۰۰)
★ سلطان العلوم اوارڈ ــ سند اور مومنٹو برائے سا
★ آندھرا پردیش اردو اکاڈمی۔ ادبی خدمات توصیف نامہ اور
اور مومنٹو ۱۹۹۳

## ادبی انجمنیں

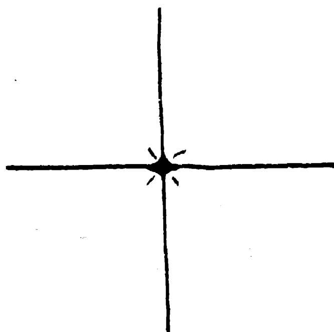
(۱) سابق نائب صدر۔ انجمن معمارِ ادب حیدرآباد
(۲) سابق صدر۔ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش

## ادارت

(۱) سابق نگراں ماہنامہ گلبانگ ادب (بمبئی)
(۲) مدیر برائے جنوبی ہند سہ ماہی تناظر (نکش انتھالوجی) افسانوی انتخاب (دہلی)

## پتہ :-

اقبال متین "کہانی" کتاب نگر۔ نظام آباد (اے پی)
۵۰۳۰۰۱ - انڈیا



# مصنف کی زیرِ طبع کتابیں

۱) صریرِ جاں .............. (شاعری)
۲) صنم کدہ .............. (خاکے)
۳) باتیں ہماریاں .............. (یادیں)
۴) بے دلی اپنا پتا پوچھے ہے .... (افسانے)
۵) آنگن میں سہاگن .......... (طویل مختصر افسانے)
۶) تار تار .............. (افسانے)

# کیسٹس Cassettes

۱) ہراسا منظوم کہانی اور دوسرے افسانے (۶۰ منٹ) اقبال متین
۲) صریرِ جاں .... غزلیں ........ اقبال متین
★ موسیقار :۔ حبیب علوی .. (۹۰ منٹ)
۳) صریرِ جاں .... غزلیں .......... اقبال متین
★ موسیقار :۔ مرزا مقصود بیگ .. (۹۰ منٹ)